Phone : 7500

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوع اسلام

مارچ ۱۹۵۹ء

رسول اللہ (صلعم) نے اپنے آخری حج کے خطبہ میں (وفات سے تین ماہ قبل) فرمایا :-

وَقَدْ تَرَكْتُ فِيكُمْ مَا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدَهُ

اِنْ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ ـــــ كِتَابُ اللهِ ـ

میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں جس سے اگر تم وابستہ رہے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے ـــ ـــ وہ چیز کتاب اللہ ہے ۔

(مسلم ـ نسائی ـ ابو داؤد)

شائع کردہ :

ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت بارہ آنے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

بدل اشتراک
ہندوستان اور پاکستان سے: آٹھ روپے
غیر ممالک سے: ۱۴ شلنگ

قیمت فی پرچہ
ہندوستان اور پاکستان سے
بارہ آنے

ٹیلی فون نمبر 7500
خط و کتابت کا پتہ: ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵- بی گلبرگ کالونی لاہور

جلد ۱۲ | مارچ سنہ ۱۹۵۹ء | نمبر ۳

فہرست مضامین

لمعات ۳

طلوعِ اسلام کنونشن (رابطہ باہمی) ۱۰

مجلس اقبال ۱۷

تفسیر المنار ۲۶

بیاد عزام ۳۷

اسلام کی سرگذشت ۵۰

روزہ کے احکام ۶۶

باب المراسلات ۷۱

نقد و نظر ۷۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

زرعی اصلاحات سے متعلق احکام صادر ہونے کے بعد، ہمیں سب سے زیادہ انتظار ارباب شریعت کے ردعمل کا تھا اس لئے کہ ان حضرات نے طلوع اسلام کو جن "جرائم" کی رو سے گردن زدنی قرار دے رکھا تھا ان میں ایک بڑا جرم یہی تھا کہ طلوع اسلام کی طرف سے یہ نظریہ پیش کیا جاتا تھا کہ قرآن کریم کی رو سے، زمین پر انفرادی ملکیت کا تصور غلط ہے زمین رزق کا سرچشمہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے تمام نوع انسانی کی پرورش کے لئے پیدا کیا ہے۔ اسے اسلامی مملکت کی تحویل میں رہنا چاہیئے تاکہ وہ ایسا انتظام کر سکے جس سے تمام افراد مملکت کی ضروریات زندگی پوری ہوتی رہیں۔ اس کے برعکس ان حضرات کا کہنا یہ تھا کہ زمین کا کلیۃً مملکت کی تحویل میں چلے جانا تو ایک طرف، مملکت کو اس کا بھی حق حاصل نہیں کہ وہ اس قسم کی پابندی عائد کر دے کہ کسی کے پاس اتنے ایکڑ سے زیادہ اراضی نہیں رہ سکتی۔ اس باب میں ہم محترم سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی، امیر سابق جماعت اسلامی کی یہ تصریحات مختلف مواقع پر پیش کر چکے ہیں۔ جس میں انہوں نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ

> اسلام کے حدود میں رہتے ہوئے ہم کسی نوع کی جائز ملکیتوں پر نہ تو تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی عائد کر سکتے ہیں اور نہ ایسی من مانی قیود لگا سکتے ہیں جو شریعت کے دیئے ہوئے جائز حقوق کو عملاً سلب کر لینے والی ہوں..... جس طرح وہ (اسلام) ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو، اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔
>
> (مسئلہ ملکیت زمین - صفحہ ۴۲-۴۳)

مودودی صاحب نے اس تصور کو اپنے ذاتی خیالات کی حیثیت سے پیش نہیں کیا تھا۔ انھوں نے کہا یہ تھا کہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ زمین یا روپے کی مقدار ملکیت پر کسی قسم کی حدبندی عائد کی جائے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ "اسلام کی حدود میں رہتے ہوئے۔ ہم ایسا کر نہیں سکتے یعنی اگر کسی نے ایسا کیا تو اس کا یہ عمل اسے اسلام کی حدود سے خارج کر دے گا۔ اسی بنا پر جماعت اسلامی کے ترجمان صحائف طلوع اسلام کے اس نظریہ کو کہ اسلامی مملکت میں زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی اور کوئی شخص اپنی ضروریات سے زیادہ روپیہ اپنے پاس نہیں رکھ سکتا، دین میں فتنہ۔ بدعت اور نہ جانے کیا کیا قرار دیتے تھے۔ ان کا یہ "جہاد" برسوں سے مسلسل اور پیہم جاری تھا۔

زرعی اصلاحات کے احکام صادر ہونے کے بعد محترم مودودی صاحب کا کوئی بیان (اس وقت تک) ہماری نظروں سے نہیں گذرا۔ البتہ ان کے دست راست (سابق) جماعت اسلامی کے حلقہ لاہور کے امیر محترم نصر اللہ خاں صاحب عزیز کے ہفتہ وار اخبار "ایشیا" کی ۲۶ فروری کی اشاعت میں "زرعی اصلاحات کی اسکیم" کے عنوان سے مقالہ افتتاحیہ شائع ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے پہلے انگریز کے عہد میں زمینداروں کے مظالم اور مفاسد کو گنایا ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ

> غلامی کی زنجیریں ٹوٹنے کے بعد ضرورت تھی کہ ان فراعنۂ عصر کے اقتدار کو بھی ختم کیا جاتا۔ چنانچہ ہندوستان میں چند سال کے اندر ہی ان کو ختم کر کے رکھ دیا گیا مگر پاکستان میں اس ہشیار طبقے نے جو ہوا کا رخ پہچاننے میں بے مثال بصیرت سے بہرہ مند ہے اور چڑھتے ہوئے سورج کی پہلی کرنوں کو دیکھ لینے میں ماہر ہے آنے والے انقلاب کو اس کی پیشانی کے بالوں سے پکڑ لیا اور پاکستان بننے کے امکانات کا اندازہ لگا کر اس کی تحریک کا مقدمۃ الجیش بن گیا۔ چنانچہ جب پاکستان بنا تو یہی زمیندار اور جاگیردار اس کی قیادت کی صف اول میں موجود تھے اور اقتدار کے مناصب پر فائز۔

اس کے بعد معاصر مذکور لکھتا ہے۔

> انسانی فطرت کا یہ پیش پا افتادہ راز ہے کہ جب قانون سازی انسانوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے تو وہ اپنے ہی طبقے اور گروہ اور جماعت کے مفادات و مصالح کو پیش نظر رکھ کر قانون بناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی قانون سازی ہمیشہ غیر عادلانہ اور جانبدارانہ رہی ہے۔ اور صرف وہ قانون سازی ہی حق و عدل پر مبنی ثابت ہوئی ہے جس کی عنان اللہ تعالےٰ کے دست قدرت میں رہی ہے۔ اسلام کی حقانیت کا سب سے بڑا ثبوت ہی یہ ہے کہ اس کے ضابطۂ حیات کو اللہ تعالےٰ نے مرتب فرمایا ہے جو نوع انسانی کے ساتھ یکساں تعلق رحمت رکھتا ہے۔ وہ سب سے بالا، سب سے بلند، سب سے بے نیاز اور واحد و صمد ہے۔ نہ اسے کسی نے جنا اور نہ اس نے کسی کو جنا۔ نہ کسی طبقۂ خاص سے اس کا تعلق خاص ہے۔ اور نہ وہ کسی خاص گروہ کی طرف جھکاؤ رکھتا ہے۔ اس کی زندگی کی اسکیم میں ہر انسان کی بہتری اور مفاد کو ملحوظ

> رکھا گیا ہے۔ لیکن یہ بات انسانی قانون سازی میں نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اس دس گیارہ برس کی مدت میں ہر چند عوامی رائے نے زرعی مفاسد کی اصلاح کی طرف توجہ دلائی مگر اس راہ میں کوئی قدم نہ اٹھایا گیا اور اگر کبھی کوئی قدم اٹھایا بھی گیا تو اس کی غرض بھی صرف یہ تھی کہ زمینداروں اور جاگیرداروں کو آنے والے حالات کی پیش بندی کا موقع مل جائے اور وہ اپنی گرفت زیادہ سے زیادہ مضبوط کر سکیں۔ ہمارے ملک میں جمہوریت کو جن مصائب کا سامنا ہوا ان کی تہہ میں زمینداری کا ناقص اور فاسد نظام بھی تھا۔ بڑے بڑے زمیندار حکومت اور حکام کو اپنے اغراض کے لئے استعمال کرتے انتخابات میں وہ دھاندلی چلاتے تھے کہ انسانی ضمیر الامان پکار اٹھتا تھا۔ اور اپنی دھاندلی کے ذریعے جمہوری نظام پر مسلط ہو کر وہ اسے ایک حرف بے معنی بنا کر رکھ دیتے تھے۔

اے کاش! ہمارے معزز معاصر کو یہ کہنے کی توفیق بھی عطا ہو جاتی کہ زمینداروں کے اس ناقص اور فاسد نظام کے سب سے بڑے محافظ وہ ارباب شریعت تھے جو یہ فتاوی صادر فرماتے تھے کہ اسلام ہمیں اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ ان زمینداروں کے وسیع و عریض رقبوں پر کسی قسم کی حد بندی عائد کر دی جائے!

اس کے بعد معاصر مذکور رقمطراز ہے۔

> وقت کی پکار عرصے سے سنی جا رہی تھی کہ اگر اس ملک میں جمہوریت کو صحیح طور پر کام کرنے کا موقع دینا ہے تو <u>زمینداریوں کی تحدید</u> اور جاگیرداری کی تنسیخ کے بغیر چارہ نہیں۔ اس زرعی اسکیم میں یہ دونوں باتیں موجود ہیں۔

آپ ان الفاظ کو پڑھتے وقت اپنی آنکھیں نہ ملئے۔ یہ واقعی (سابق) جماعت اسلامی کے ترجمان، ایشیا کی ۲۶ فروری کے مقالہ افتتاحیہ کے الفاظ ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ "وقت کی پکار عرصے سے سنی جا رہی تھی کہ ملک میں جمہوریت کو صحیح طور پر کام کرنے کا موقع دینا ہے تو زمینداریوں کی تحدید اور جاگیرداری کی تنسیخ کے بغیر چارہ نہیں" کوئی ان حضرات سے پوچھے کہ وقت کی اس پکار کا گلا کون گھونٹ رہا تھا؟ کیا وہی ہاتھ نہیں جو یہ لکھتے تھے کہ تم اسلام کی حدود میں رہتے ہوئے زمینداریوں کی تحدید قطعاً نہیں کر سکتے؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ وقت کی اس آواز کو دبانے میں خود آپ حضرات سب سے پیش پیش تھے؟ کیا آپ ہی وہ نہیں تھے جو زمینداروں کے مفاد کو "شریعت حقہ" کا نقاب اوڑھا کر ایسا مقدس قرار دیے رہے تھے کہ اس کے خلاف آواز اٹھانے والے آپ کی بارگاہ سے ملحد و بے دین کا خطاب پاتے تھے؟ آج آپ یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ

> بیس مربعے اور چالیس مربعے کی مقدار بظاہر حالات بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

لیکن اس وقت آپ کا ارشاد یہ تھا کہ خدا و رسول کے احکام کے مطابق زمین کی مقدار پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی!

یہاں تک ہم نے جماعتِ اسلامی کے ترجمان کے ردِ عمل کا ذکر کیا ہے۔ اربابِ شریعت میں ایک گروہ حضرات اہلِ حدیث کا ہے۔ ان لوگوں کی کیفیت یہ تھی کہ طلوعِ اسلام کے اس نظریہ کے خلاف (کہ زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی اور زائد از ضرورت روپیہ کسی کے پاس نہیں رہنا چاہیئے) ان کی طرف سے روایات پر روایات پیش ہوتی چلی آتی تھیں جن میں بتایا جاتا تھا کہ عہدِ نبوی اور عہدِ خلافتِ راشدہ میں صحابہؓ کے پاس بے حد و نہایت رقبات اراضی تھے اور وہ زمین کو کرایہ یا بٹائی پر دیتے تھے۔ اس لئے جو شخص یہ کہتا ہے (خواہ وہ ایسا کہنے میں قرآن کی آیات ہی کیوں نہ پیش کرے) کہ زمین افراد کی ملکیت میں نہیں رہ سکتی بلکہ اسے اسلامی مملکت کی تحویل میں رہنا چاہیئے، وہ منکرِ حدیث اور تارکِ سنت ہے۔ جب ان سے کہا جاتا کہ یہ روایات چونکہ قرآن کے خلاف ہیں اس لئے صحیح نہیں ہو سکتیں تو ان کی طرف سے جواب ملتا کہ یہ عقیدہ کہ جو روایت قرآن کے خلاف ہے وہ صحیح نہیں ہو سکتی ملحدوں اور زندیقوں کا عقیدہ ہے۔ بہرحال ان کا بھی اسی پر اصرار تھا کہ زمین افراد کی ذاتی ملکیت کی چیز ہے جس میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔ جیسا کہ ہم نے گذشتہ اشاعت میں لکھا تھا، زرعی اصلاحات کے سلسلہ میں یہ فیصلہ کہ کوئی شخص اس قدر رقبہ سے زیادہ اراضی اپنے پاس نہیں رکھ سکتا اور اس سے زائد اراضی حکومت کی تحویل میں آجائے گی، اصولِ ملکیت کو ختم کر دیتا ہے اور اس کی بجائے اس محکم اصول کو ثبت کر دیتا ہے کہ زمین پر نظم و نسق کے کامل اختیارات مملکت کو حاصل ہیں اور وہ انتظامی سہولتوں کے پیشِ نظر جس قدر اراضی مناسب سمجھے کسی کے پاس رہنے دے۔

اب دیکھئے کہ یہ حضرات اس تحدیدِ ملکیت کے متعلق کیا فرماتے ہیں۔ لاہور سے شائع ہونے والا ہفتہ وار جریدہ الاعتصام مسلکِ اہلِ حدیث کا ترجمان ہے۔ وہ زرعی اصلاحات پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی ۶ فروری کی اشاعت میں لکھتا ہے۔

> جو کچھ ہوا ہے، کافی حد تک ٹھیک ہوا ہے۔ تحدیدِ ملکیت کے سلسلہ میں ایک سے زائد رائیں ہو سکتی ہیں لیکن اس کے ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ہم اس پر صدرِ مملکت کو ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے معمولی سے تصرف کے ساتھ یہ دعا کرتے ہیں کہ
>
> اللہ کرے زورِ عمل اور زیادہ

گویا ان حضرات نے بھی اب اسے تسلیم کر لیا ہے کہ مملکت کو حق حاصل ہے کہ جس قدر اراضی کسی کے پاس مناسب سمجھے رہنے دے، باقی اراضی اپنی تحویل میں لے لے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

زرعی اصلاحات پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے فروری ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں یہ بھی لکھا تھا کہ

> ہم اب منتظر ہوں گے کہ قرآنی نظامِ ربوبیت کے مطابق، تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کی ذمہ داری حکومت کے سر پر ہوتی ہے۔ اس اہم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے

> حکومت ذرائع پیداوار کو اپنی تحویل میں رکھتی ہے۔ ان پر ملکیت نہ افراد کی ہوتی ہے نہ مملکت کی۔ ذرائع پیداوار میں صرف زمین ہی شامل نہیں دورِ حاضر میں کارخانے بھی یہی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اب حکومت، کارخانوں کے نظام کے متعلق بھی اسی قسم کی اصلاحات پر توجہ دے گی۔ اس لئے کہ جو خرابیاں زمین سے حاصل شدہ لامحدود دولت سے پیدا ہوتی ہیں، اسی قسم کی خرابیاں کارخانوں سے حاصل کردہ لامحدود دولت سے بھی رونما ہوتی ہیں۔ قرآن ان خرابیوں کا علاج یہ بتاتا ہے کہ فاضلہ (ضرورت سے زیادہ) دولت کسی کے پاس بھی نہ رہنے دیا جائے۔ اسے قوانین خداوندی کے مطابق نوعِ انسانی کی منفعت کے لئے عام کر دیا جائے۔ خدا کرے ہماری مملکت بتدریج اس منزل تک پہونچ جائے اور اس طرح ایک ایسے انسانیت ساز معاشی نظام کو متشکل کر دکھائے جس کے سامنے امریکہ اور روس کی نگاہیں جھک جائیں۔
>
> یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است

اور اوقاف کے سلسلہ میں ہم نے کہا تھا کہ

> قرآن کی رو سے وقف کی کوئی حیثیت نہیں۔ وہ کسی مردہ کو اس کا حق نہیں دیتا کہ وہ زندہ انسانوں پر اپنا حکم چلائے اور اس طرح اپنے اختیارات کو ابدیت سے ہمکنار کر دے۔

اب دیکھئے کہ کارخانوں اور مذہبی اوقاف کے متعلق الاعتصام کیا کہتا ہے۔ وہ زرعی اصلاحات کے مذکورہ بالا تبصرہ کے بعد کہتا ہے۔

> زرعی اصلاحات کا منشا صرف غیر منصفانہ معیشت اور غیر متوازن تقسیم دولت کی اصلاح ہے یا مزارع اور غریب کاشتکاروں کے حقوق کا تحفظ۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو بعینہٖ یہی کیفیت نظام سرمایہ داری اور اوقاف خانقاہی کی بھی ہے۔ اس لئے اگر زرعی اصلاحات کے ساتھ ساتھ "زرعی اصلاحات" کا بھی کوئی منصفانہ حل اور منصوبہ تیار کر لیا جائے تو یہ بھی ملک کی ایک بہت بڑی خدمت ہوگی۔ بلکہ غیر متوازن معیشت کا یہ ایک دوسرا رخ ہے جس کی طرف اسی طرح توجہ دینا چاہئے جس طرح زرعی اصلاحات کی طرف توجہ دی گئی ہے۔
>
> کارخانہ داروں اور خانقاہی اوقاف کے مالکوں نے اپنی اپنی جگہ پر جس طرح ملک اور قوم کے حقوق کو پامال کیا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ کارخانہ دار۔ اور بڑے بڑے تاجروں نے ان لوگوں کی ضروریات اور حقِ خدمت کا قطعاً کوئی خیال نہیں کیا جن کی قوتِ بازو کے صدقے میں وہ "قارونِ زمانہ" بن گئے ہیں۔ ان سے کام ان کی قوتِ برداشت سے بھی زیادہ لیتے ہیں لیکن گزر اوقات کے لئے

اتنا بھی ان کے لئے اہتمام نہیں کرتے جتنا کہ ایک کمہار اپنے گدھے کے چارے کے لئے کیا کرتا ہے۔ اگر مزدوروں کو ان کا حق خدمت دینے میں کسی قسم کی ہمدردی کا وہ ثبوت دیتے تو نہ یہ خود اس قدر قانون زدہ ہوتے اور نہ وہ مزدور اس قدر بدحال ہوتے۔ اسلام کا یہ اعلان ہے کہ

> جس سے سارا وقت اور کام لیتے ہو اس کی ساری بنیادی ضروریات کے کفیل بھی تم ہی ہو۔

اگر اس اصول پر دیکھا جائے تو جتنے سرمایہ دار ہیں وہ قوم کی ایک بہت بڑی طاقت (مزدور) کے حوصلہ شکن اور ان کے حقوق کے بہت بڑے غاصب ہیں۔ اس لئے اس مرحلہ پر ان کی چیرہ دستیوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔

اسی طرح بزرگوں اور خانقاہوں کے نام کی جائدادیں وقف ہیں، ان کی غرض صرف یہ تھی کہ تزکیہ و طہارت کی غرض سے جو تربیت گاہیں بزرگوں کو قائم کرنا پڑتی تھیں۔ ان کی اعانت کی جائے۔ اگر بعد میں وہ ان کی اولاد اور وارثوں کے تعیش کی لونڈی بن کر رہ جائیں تو ظاہر ہے وہ ان کا مصرف نہیں ہے بلکہ اسلامی تعلیم و تربیت اور تزکیہ و طہارت کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں

اس لئے اب ان دونوں کی اصلاح حال کی طرف توجہ دی جاہیئے۔ گو بات یہ کڑی ہے مگر پھل اس کا صد درجہ میٹھا ہوگا۔ انشاء اللہ۔

آپ نے غور فرمایا کہ مسلسل دس برس سے طلوع اسلام کو گالیاں دینے کے بعد یہ حضرات کس طرح زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر قرآن کی طرف آرہے ہیں۔ طلوع اسلام کا یہ پیغام تھا کہ قرآن کی رو سے، اسلامی مملکت کی ذمہ داری ہے کہ وہ حسب استعداد افراد مملکت کے سپرد مختلف کام کرے اور ان کی (اور ان کے اہل و عیال کی) تمام بنیادی ضروریات بہم پہنچانے کی ذمہ داری اپنے سر پر لے۔ اس کے اس پیغام کی بھی سخت مخالفت ہوتی تھی، لیکن اب یہی مخالفین کہہ رہے ہیں کہ

> اسلام کا اعلان یہ ہے کہ جس سے سارا وقت اور کام لیتے ہو اس کی ساری بنیادی ضروریات زندگی کے کفیل بھی تم ہی ہو۔

ہمیں اس کا قطعاً رنج نہیں کہ یہ حضرات طلوع اسلام کو گالیاں کیوں دیتے رہے (اور یہ اب بھی کون سے باز آجائیں گے) ہمیں اس کی انتہائی خوشی ہے کہ یہ لوگ کس طرح قرآن کے قریب آنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ اور قرآن اپنی صداقتوں کو کس شد و مد سے منوا رہا ہے! اس تصور سے ہماری روح وجد میں آجاتی ہے۔ ہمارا دل رقص کرنے لگ جاتا ہے۔ اور جوش مسرت سے ہماری جبین نیاز بارگہ صمدیت میں سجدۂ شکرانہ کے لئے بار بار زمیں بوس ہو جاتی ہے۔ معاصر ایشیا نے لکھا ہے کہ

انسانی فطرت کا یہ بیش بہا افتادہ راز ہے کہ جب قانون سازی انسانوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے تو وہ

اپنے ہی طبقہ اور گروہ اور جماعت کے مفادات و مصالح کو پیشِ نظر رکھ کر قانون بناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی قانون سازی ہمیشہ غیر عادلانہ اور جانبدارانہ رہی ہے اور صرف وہ قانون سازی ہی حق و عدل پر مبنی ثابت ہوئی ہے جس کی عنان اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت میں رہی ہے۔ اسلام کی حقانیت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس کے ضابطۂ حیات کو اللہ تعالیٰ نے مرتب فرمایا ہے جو پوری نوعِ انسانی کے ساتھ یکساں تعلقِ رحمت رکھتا ہے۔ وہ سب سے بالا، سب سے بلند، سب سے بے نیاز اور واحد و صمد ہے۔ نہ اسے کسی نے جنا۔ نہ اس نے کسی کو جنا۔ نہ کسی طبقہ خاص سے اس کا تعلق خاص ہے اور نہ وہ کسی خاص گروہ کی طرف جھکاؤ رکھتا ہے۔ اس کی زندگی کی اسکیم میں ہر انسان کی بہتری اور مفاد کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ لیکن یہ بات انسانی قانون سازی میں نہیں ہو سکتی تھی۔

بلفظہٖ وہی مسلک ہے جسے طلوعِ اسلام ایک مدت سے پیش کرتا چلا آرہا ہے (اور جس کی پاداش میں اس کے ساتھ یہ کچھ سلوک ہو رہا ہے!) خدا کا قانون اس کی کتاب میں محفوظ ہے اور اس میں ہر فردِ انسانیہ کی ربوبیت کا خیال رکھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ رزق کے سرچشموں پر کسی فرد کی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ انھیں نوعِ انسانی کی ضروریات کے لئے کھلا رہنا چاہیئے۔ لیکن اس کے برعکس، وہ قانون جو یہ کہتا ہے کہ زمین۔ کارخانے۔ دولت وغیرہ پر کسی قسم کی حدبندی عائد نہیں کی جا سکتی؛ انسانوں کا خود ساختہ قانون ہے جو خاص گروہوں کے مفاد کے تحفظ کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ پھر جس طرح یہ قانون خاص گروہوں کے مفاد کی خاطر آج وضع کیا گیا ہے۔ اسی طرح، اس قسم کے قوانین خاص گروہوں کے مفاد کی خاطر، اس سے پہلے بھی وضع ہوتے رہے ہیں۔ یہ قوانین ہمارے دورِ ملوکیت اور نظامِ سرمایہ داری کے عہد میں وضع ہوتے تھے۔ اُن میں اور آج کے قوانین میں فرق صرف اتنا ہے کہ وہ قوانین آج سے چند صدیاں پہلے وضع ہوئے تھے۔ فلہٰذا اگر آج کے انسانوں کے وضع کردہ قوانین حق و عدل پر مبنی نہیں ہو سکتے۔ (حق و عدل پر مبنی صرف خدا کا متعین کردہ قانون ہی ہو سکتا ہے) تو آج سے چند سو سال پیشتر کے انسانوں کے وضع کردہ قوانین کس طرح حق و عدل پر مبنی ہو سکتے ہیں! اگر یہ اصول صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ جس (انسانوں کے خود ساختہ) قانون پر چند صدیاں گذر جائیں وہ مقدس بن جاتا ہے تو آج کے انسانوں کا وضع کردہ قانون بھی چند صدیوں بعد خود بخود مقدس بن جائے گا۔ یاد رکھیئے۔ جس طرح یہ کہنے والے کہ

> جس طرح اسلام ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ۔ اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار۔ اتنا صنعتی کاروبار۔ اتنے مویشی۔ اتنی موٹریں۔ اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔

آج پیدا ہو سکتے ہیں، اسی طرح یہ کچھ کہنے والے، اس سے پہلے بھی پیدا ہوتے رہے ہیں۔ جو پہلے پیدا ہوئے تھے، وہ ہمارے "اسلاف" ہیں۔ جو آج ایسا کہتے ہیں وہ آنے والوں کے اسلاف ہو جائیں گے۔ اس لئے قانون کے صحیح ہونے کی سند نہ زید ہے نہ بکر، نہ اسلاف ہیں نہ اخلاف۔ اس کی سند ہے اللہ کی کتاب۔ جو اس کے مطابق ہے وہ صحیح ہے جو اس کے خلاف ہے وہ غلط ہے۔ خواہ اسے کسی کی بدنیتی یا نادانی کسی بڑی سے بڑی ہستی کی طرف بھی منسوب کیوں نہ کر دے۔ طلوع اسلام کا مسلک یہ ہے کہ جو کچھ ہمارے ہاں پہلے سے چلا آرہا ہے اور جو کچھ کوئی آج کہتا ہے، اسے اللہ کی کتاب کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ لو۔ جو اس کے مطابق ہے وہ صحیح ہے۔ جو اس کے خلاف ہے وہ غلط ہے

اسلام کی صداقت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس کے ضابطۂ حیات کو اللہ تعالیٰ نے مرتب فرمایا ہے۔

اور وہ ضابطۂ حیات ہمارے پاس اپنی اصلی شکل میں حرفاً حرفاً محفوظ چلا آرہا ہے۔ وذالک الدین القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون۔

(۲)

پرچہ پریس میں جانے کے لئے تیار تھا کہ حکومت کی طرف سے صنعتی پالیسی کا اعلان (اخبارات کے ذریعہ) سامنے آیا۔ حکومت نے سردست صنعت (INDUSTRY) کو "قومیانے" (NATIONALISE کرنے) کا فیصلہ تو نہیں کیا، لیکن اس جدید پالیسی میں بہت سے امور ایسے ہیں جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ صحیح سمت کی طرف اقدامات ہیں۔ مثلاً اعلان میں کہا گیا ہے کہ حکومت اس کی اجازت نہیں دے گی کہ بڑی بڑی صنعتیں چند افراد کے ہاتھوں میں مختص ہو کر رہ جائیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا ہے کہ صنعت میں صحتمندانہ مقابلہ کی حوصلہ افزائی کی جائے گی لیکن ایسی صورت پیدا نہیں ہونے دی جائے گی کہ کسی صنعت پر کسی کی اجارہ داری قائم ہو جائے۔

یہ فیصلہ بحالات موجودہ بڑا اطمینان بخش ہے۔ قرآن کا منشا یہ ہے کہ دولت اوپر کے طبقے میں گردش نہ کرتی رہے بلکہ اس کا بہاؤ عام ہو اور اس کی ایک شکل یہ بھی ہو کہ صنعت کو چند خاندانوں کی اجارہ داری نہ بنا دیا جائے۔ اعلان میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو صنعتیں قوم کی زندگی کے لئے ضروری ہیں اگر لوگوں نے انہیں اختیار کرنے میں کوتاہی برتی تو انہیں حکومت خود اپنے اہتمام سے چلائے گی۔ اس کے ساتھ ہی حکومت نے یہ بھی اعلان کیا ہے کہ صنعت کے متعلق منصوبہ بندی اور دیگر تضمنات مرکزی حکومت کی ذمہ داری ہوگی اور صوبائی حکومتیں مرکز کے فیصلوں کو بروئے کار لانے کا ذریعہ ہوں گی (بجز ان صنعتوں کے جن کی عملی تشکیل بھی مرکزی حکومت خود ہی کرے) جہاں تک عام (صارفین) کا تعلق ہے اعلان میں کہا گیا ہے کہ

حکومت ان کے مفاد کو ہمیشہ مدنظر رکھے گی اور یہ دیکھے گی کہ مصنوعات معقول اور مناسب قیمتوں پر فروخت ہوں۔ (بحوالہ پاکستان ٹائمز ۲۰ فروری)

ہم حکومت کے ان فیصلوں کو مستحسن دیکھتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ وہ رفتہ رفتہ ملک کو قرآن کے تجویز کردہ معاشی نظام تک پہنچا دے گی جس کا اصل الاصول یہ ہے کہ حکومت تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچائے اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے اسباب و ذرائع مہیا کرنے کی ذمہ دار ہوگی اور اس ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے لئے وسائل پیداوار مملکت کی تحویل میں رہیں گے۔

طلوعِ اسلام کنونشن

قرار پایا تھا کہ طلوع اسلام کنونشن، رمضان المبارک کے فوری بعد لاہور میں منعقد کی جائے۔ اندازہ یہ ہے کہ عید الفطر ۱۱ یا ۱۲ اپریل کو ہوگی۔ لہٰذا کنونشن اس سے اگلے ہفتہ میں منعقد کی جا سکتی ہے ۱۹ اپریل کو اتوار ہے اور ۲۱ کو اقبال ڈے کی تقریب پر دفاتر میں تعطیل ہے۔ اس لئے فیصلہ کیا گیا ہے کہ کنونشن ۱۹ اپریل سے ۲۱ اپریل (اتوار، سوموار، منگل وار) کو منعقد کی جائے۔

چونکہ پہلا (تعارفی) اجلاس ہفتہ (۱۸ اپریل) کی شب کو منعقد ہوگا اور ہو سکتا ہے کہ اس میں بعض دیگر امور بھی طے کر لئے جائیں۔ اس لئے احباب کو چاہیئے کہ ہفتہ کی شام تک لاہور پہنچ جائیں۔

جو احباب ہفتہ کی شام تک لاہور پہنچ رہے ہوں۔ وہ اپنی آمد کے متعلق پہلے اطلاع فرما دیں۔ ہفتہ کی شب کے کھانے کا انتظام صرف انہی احباب کے لئے کیا جا سکے گا جو اپنی آمد کی اطلاع پہلے دیدیں گے۔

۲۔ کنونشن میں شریک ہونے والے اراکین کی تعداد پر کوئی پابندی نہیں۔

۳۔ بزم ہائے طلوع اسلام کے اراکین، اپنی اپنی بزم کی وساطت سے شریک اجتماع ہو سکیں گے۔

۴۔ جو حضرات کسی بزم کے رکن نہیں ہیں لیکن طلوع اسلام کے مقصد و مسلک سے متفق ہیں، وہ بطور مبصر شریک اجتماع ہو سکیں گے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اجتماع کی کارروائی میں کسی قسم کا حصہ نہیں لے سکیں گے۔ ایسے حضرات کنونشن میں شرکت کے لئے اپنی درخواست مع مبلغ پندرہ روپیہ فی کس، اپنی قریب ترین بزم کی وساطت سے بھیجیں۔ بزم ایسی درخواستوں کو اپنی سفارش کے ساتھ، صدر کنونشن کمیٹی کے پاس بھیجدے۔ جن حضرات کو اس کا علم نہ ہو کہ ان کے قریب ترکس مقام میں بزم موجود ہے، وہ اپنی درخواست براہ راست صدر کنونشن کمیٹی کے پاس بھیجدیں۔

۵۔ بزموں کے اراکین ہوں یا دیگر حضرات۔ کنونشن میں وہی شریک ہو سکیں گے۔ جن کے نام صدر کنونشن کمیٹی کی طرف سے دعوت نامے جاری ہوں گے۔ جن کے نام دعوت نامے جاری نہیں ہوں گے ان کا زر اخراجات واپس کر دیا جائے گا۔

(۶) ہر ایک بزم کنونشن میں شریک ہونے والے حضرات (اراکین یا غیر اراکین) کی فہرست مع زرِ اخراجات بحساب پندرہ روپیہ فی کس، پندرہ مارچ تک

محترم عبد الرب صاحب

ادارۂ طلوعِ اسلام۔ B-25 گلبرگ کالونی۔ لاہور

کے نام بھیجدیں۔ زرِ اخراجات منی آرڈر، چیک۔ ڈرافٹ یا پوسٹل آرڈر کی شکل میں بھیجا جاسکتا ہے۔ ہر صورت میں ارسال کنندہ کا نام مع پتہ درج ہونا ضروری ہے۔

نوٹ:- زرِ اخراجات کی رقم بالکل الگ بھیجی جائے۔ یعنی اسے ادارہ طلوعِ اسلام کے ساتھ کسی قسم کے حساب میں شامل نہ کیا جائے۔

(۷) جو بزمیں یا افراد، پندرہ مارچ تک اپنا نام اور زرِ اخراجات ارسال نہیں فرمائیں گے۔ ان کے نام دعوت نامے بھیجے جانے مشکل ہوں گے۔ اسے خاص طور پر نوٹ کر لیجئے تاکہ بعد میں شکایت نہ ہو۔

۸- جو بزم کنونشن میں کوئی ریزولیشن پیش کرنا چاہے، اسکی نقل یکم اپریل سے پہلے محترم عبد الرب صاحب کے نام پہنچ جانی چاہیئے۔ اس کے بعد موصول قراردادیں ایجنڈے میں شامل نہیں کی جاسکیں گی۔ نہ ہی وہ قراردادیں جو بزم متعلقہ کی وساطت کے بغیر براہِ راست موصول ہوں گی۔

۹- آمد۔ قیام۔ پروگرام وغیرہ سے متعلق ہدایات اپریل کے طلوعِ اسلام میں شائع کی جائیں گی۔ واضح رہے کہ وسطِ اپریل میں لاہور میں موسم بڑا خوشگوار ہوتا ہے۔ اور ہلکے پھلکے کپڑوں میں گذارہ ہو جاتا ہے۔

(چوہدری) عبد الرحمٰن (صدر کنونشن کمیٹی)

بہترین ہاؤس۔ متصل منٹ۔ شالامار ٹاؤن

لاہور

ادارہ کی طرف سے بزموں کے نام ضروری پیغام

قرآنی فکر کی اشاعت میں ادارہ کے شائع کردہ پمفلٹ بہت مفید ثابت ہوئے ہیں۔ مختصر ہونے کی وجہ سے لوگ انھیں بآسانی پڑھ لیتے ہیں اور جو طبیعتیں سلیم ہیں وہ قرآنی تعلیم کو فوراً قبول کر لیتی ہیں۔ بزمہائے طلوعِ اسلام کی محنت کو نتیجہ خیز بنانے میں پمفلٹوں کی تقسیم بہت کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ بزموں کے نمائندے کنونشن میں شرکت کے لئے لاہور تشریف لائیں گے۔ اس موقع سے فائدہ اس طرح اٹھایا جاسکتا ہے کہ بزمیں زیادہ سے زیادہ تعداد میں پمفلٹ طلب کریں اور

اپنی اپنی ضروریات ادارہ کو جلد بھیجیں تاکہ پیکٹ تیار اور کنونشن کے موقع پر نمائندگان کے حوالے کر دیئے جائیں۔ اس طریقہ سے بزموں کو خرچ ڈاک بھی بچ جائے گا۔ ادارہ پمفلٹ لاگت پر دیتا ہے اور ان سے منافع حاصل نہیں کرتا۔

اشاعت کے سلسلہ میں طلوع اسلام کے پرانے پرچوں کی تقسیم بھی مفید رہتی ہے۔ ۱۹۵۷ء اور اس سے قبل کے موجود پرچے ادارہ نصف قیمت پر فروخت کرتا ہے لیکن بزموں کو خاص رعایت ہے۔ یہ پرچے چوتھائی قیمت پر دیئے جاتے ہیں۔ گویا ایک پرچہ کی قیمت تقریباً وہی ہو جاتی ہے جو عام طور پر ایک پمفلٹ کی ہوتی ہے۔ اسلئے بزموں کو پرانے پرچے بھی حاصل کرنے چاہئیں تاکہ ان کی تقسیم سے اشاعت کا کام آگے بڑھے۔ پرانے پرچے بھی نمائندگان کے ذریعہ کنونشن کے موقع پر خریدے جا سکتے ہیں۔ بہتر تو یہی ہے کہ ان پرچوں کی مطلوبہ تعداد بھی پمفلٹوں کی تعداد کے ساتھ ادارہ کو قبل از کنونشن بتا دی جائے تاکہ انہیں بھی ہر بزم کے پیکٹ میں شامل کر دیا جائے۔

مختصراً کرنے کا کام یہ ہے کہ

(i) ہر بزم یہ طے کرے کہ وہ کس قدر رقم کے پمفلٹ اور پرانے پرچے خرید سکیگی۔

(ii) اس فیصلے سے ادارہ کو کنونشن سے بہت پہلے اطلاع دی جائے۔

(iii) کنونشن میں شریک ہونے والے نمائندگان ان رقوم کو اپنے ہمراہ لائیں۔

(iv) کنونشن میں پمفلٹوں اور پرانے پرچوں کے بنڈل نمائندگان کے حوالے کر دیئے جائیں گے جنہیں وہ اپنے ہمراہ لے جائیں۔

یہ پروگرام کنونشن میں شرکت کا ایک اہم جزو ہے۔

رابطۂ باہمی

سرگودھا کا دورہ سرگودھا میں ابھی تک بزم طلوع اسلام قائم نہیں ہوئی تھی۔ چک ۱۰ شمالی کے چوہدری نصر اللہ خاں جو طلوع اسلام کی قرآنی فکر کے دیرینہ ہم نواؤں میں سے ہیں سرگودھا میں اجتماع کے لئے کوشاں تھے۔ بارے شروع فروری میں، محترم خان بہادر حافظ عبدالحکیم صاحب کے حسن توسط سے اس اجتماع کا انتظام ہو گیا۔ (خان بہادر صاحب محترم پرویز صاحب کے زمانۂ ملازمت کے قدیم کرم فرماؤں میں سے ہیں اور اپنے احباب کے حلقہ میں بڑی عزت اور احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کا یہ احترام، ان کی ان بے لوث خدمات کی بنا پر ہے جو انہوں نے دہلی اور شملہ میں، مسلمانوں کی بہبود کے لئے بیس پچیس سال تک مسلسل سر انجام دیں) اس انتظام کے مطابق، پرویز صاحب

اپنے رفقاء کی معیت میں ۱۰ فروری (بروز جمعۃ المبارک) ۱ بجے کے قریب سرگودھا پہنچے۔ بعد نماز مغرب ٹاؤن ہال میں اجتماع تھا۔ ہال سامعین سے پر تھا۔ محترم خان بہادر صاحب نے اپنے صدارتی افتتاحیہ میں پرویز صاحب کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ انھوں نے سنہ ۱۹۲۷ء سے لے کر آج تک ملت اسلامیہ کے لئے کیا کچھ کیا ہے۔ اس کے بعد پرویز صاحب نے قرآن کے معاشی نظام کے عنوان پر بصیرت افروز تقریر فرمائی۔ اس سے دین کے مختلف گوشے اس قدر وضاحت سے سامنے آگئے کہ آخر میں جب سوالات کے لئے کہا گیا تو صرف ایک مختصر سے سوال کے علاوہ کسی کو کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ یہ اجتماع بڑا کامیاب رہا۔ اس سے جہاں یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ طلوع اسلام کا پیغام اور مشن کیا ہے۔ وہاں ان غلط فہمیوں کا بھی ازالہ ہو گیا جو مفاد پرست طبقہ کی طرف سے طلوع اسلام اور پرویز صاحب کے متعلق پھیلائی جاتی ہیں۔

۱۱ فروری کی صبح، قرآنی فکر سے دلچسپی رکھنے والے احباب مختلف اطراف و جوانب اور دور دراز گوشوں سے آنے شروع ہو گئے۔ اس غیر رسمی اجتماع میں قرآنی فکر کے بہت سے گوشوں کی مزید وضاحت ہوتی رہی۔ وہاں سے ایک بجے کے قریب گورنمنٹ کالج پہنچے جہاں پرویز صاحب کو طلباء سے خطاب کرنا تھا۔ اس اجتماع کا اہتمام محترم چوہدری نور محمد صاحب (پروفیسر طبیعیات) کی مساعی جمیلہ کا رہین کرم تھا۔ سرگودھا کالج بہت بڑی درسگاہ ہے جس میں قریب پندرہ سو طلباء تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ لیکچر کے وقت کالج کا وسیع ہال طلباء، پروفیسر حضرات اور بیرونی احباب سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ علم کے موضوع پر خطاب تھا جسے طلباء نے انتہائی ذوق و انہماک سے سنا۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارا نوجوان طبقہ اب بھی قرآن کریم سے کس قدر شیفتگی رکھتا ہے بشرطیکہ ان تک قرآن کا پیغام صحیح انداز میں پہنچایا جائے۔ اس خطاب سے طلباء کا حلقہ بڑا متاثر ہوا اور انھوں نے تقاضا کیا کہ پرویز صاحب کسی دوسرے موقع پر بھی کالج میں ضرور تشریف لائیں۔

لیکچر کے بعد احباب سے رخصت ہو کر یہ قافلہ لاہور واپس آگیا۔ سرگودھا کے احباب کی طرف سے الوداعی تحفہ اس خوشخبری کا اعلان تھا کہ سرگودھا میں بزم طلوع اسلام قائم کر دی گئی ہے۔

ادارہ طلوع اسلام سرگودھا کے جملہ احباب (بالخصوص محترم خان بہادر صاحب)، نیز سرگودھا کالج کے پرنسپل اور پروفیسر نور محمد صاحب کا بدل شکر گذار ہے کہ ان کی سعی و کاوش اور حسن تعاون سے قرآن کریم کے پیغام کو اس علاقے کی فضا میں پھیلنے کا موقعہ مل گیا۔ وذالک تمام من اللہ۔

ماہانہ رپورٹوں کا ملخص

ضلع جہلم کتب (۱۰) اور پمفلٹ (۳۰) تقسیم کئے گئے۔ دلچسپی رکھنے والے احباب کے گھر جا کر تبادلہ خیالات

کیا گیا۔ جہلم شہر میں ابتدائی بزم کی تشکیل کے لئے کوشش کی گئی۔

سید حسن — ممبران نے اپنے اپنے طور پر کتب اور پمفلٹ مطالعہ کے لئے تقسیم کئے۔ ممبران سوچ کر بتائیں گے کہ وہ اشاعت کے لئے کیا دے سکتے ہیں؟

پنڈ دادنخان — محترم پرویز صاحب کے دورہ جہلم میں ممبران نے شرکت کی۔ پمفلٹ تقسیم کئے۔ بزم کے اجتماعات میں طلوع اسلام کے مضامین پڑھ کر سنائے گئے۔ اہل فکر اصحاب کو مطالعہ کے لئے کتب دی گئیں شہر میں بھی اور شہر سے باہر بھی۔

جھنگ ضلع

اجلاس باقاعدہ ہوئے۔ عوام سے رابطہ قائم کیا۔ لائبریریوں میں رسالہ بھیجا گیا۔ ترجمان نے چنیوٹ کا دورہ کیا اور قرآنی فکر کے مختلف موضوعات پر احباب سے گفتگو کی۔ مرکز کو لکھا گیا کہ محترم پرویز صاحب کے دورہ لائلپور کے پروگرام سے بزموں کو قبل از وقت مطلع کیا جائے تاکہ وہ بھی شرکت کر سکیں۔

چک ۲۲۸ — لمعات اور لٹریچر تقسیم کئے۔ چک ۲۳۲ کے اسلامیہ ہائی اسکول میں عربی کے استاد کو "اسلامی معاشرت" دی گئی تاکہ وہ طلباء کو سمجھائیں۔ تحریک کی گئی کہ اسکول مذکور طلوع اسلام کا خریدار بن جائے۔

چنیوٹ — ڈاکٹر عبدالوہاب عوام کی وفات پر اظہار افسوس کیا گیا جو امت اسلامیہ کے لئے حادثۂ عظیم ہے۔ سیکرٹری ضلع بزم نے سرگودھا سے واپسی پر (جہاں وہ محترم پرویز صاحب کے دورہ کے موقع پر گئے تھے) چنیوٹ میں قیام کیا اور بزم کی سرگرمی کو تیز تر کرنے کے لئے مشورہ میں شرکت کی۔ ضلع بزم کے آئندہ جلسہ میں جو کھریں میں ہوگا ابتدائی بزموں کے ارکان کو شرکت کی دعوت دی گئی ہے۔ ضلع جھنگ کے خریداران طلوع اسلام کے پتے ادارہ سے مانگے گئے تاکہ ان سے رابطہ قائم کیا جا سکے۔

ڈیرہ غازیخاں ضلع

طے پایا کہ طلوع اسلام کی پانچ کی بجائے بیس کاپیاں طلب کی جائیں اور یہ کہ ضلع بھر کے صاحب ذوق اصحاب کو پمفلٹ بصیغہ ڈاک بھیجے جائیں۔

جام پور — قابل ذکر کچھ نہیں۔

سیالکوٹ

ابتدائی۔ ہفتہ واری اجتماعات ہوئے جن میں قرآنی نظام ربوبیت پر گفتگو ہوئی۔

شیخوپورہ

" — اندازاً پچاس اصحاب کو پمفلٹ بھیجے۔ صدر کونسل کمیٹی کو دس روپے بھیجے گئے

کوہاٹ

ہنگو — ہفتہ وار جلسوں میں مدعو کردہ تعلیم یافتہ اشخاص شریک ہوئے۔ اراکین نے مہینہ میں ایک بار قریبی دیہات کا دورہ کیا۔ تاکہ خالص قرآنی فکر سے لوگوں کو آشنا کیا جائے۔

لاہور

قصور۔ پڑھنے کے لئے لوگوں کو لٹریچر دیا گیا۔

مردان

ابتدائی۔ طلوع اسلام کے خریداروں میں اضافہ کی جدوجہد جاری رہی۔ جن اصحاب کو پڑھنے کے لئے بزم

رسالہ مفت دیتی تھی ان میں سے دو خریدار بن گئے ہیں۔ سالبقہ پیشگی خریدار ان سے ملا گیا۔ ان میں سے ایک صاحب نے مزید زر پیشگی ادا کیا۔ ماہ فروری میں ایک اجتماع ہونا قرار پایا جس میں گرد و نواح اور پشاور کی بزمیں شرکت کریں۔ لیکن بارشوں کی وجہ سے ملتوی کرنا پڑا۔

ملتان　پنچ کسی　باہمی گفتگو سے شکوک کا ازالہ کیا گیا۔ ادارہ کی مختلف کتب اور رسالہ کے سالبقہ فائل اراکین اور متفقین کے زیر مطالعہ ہے۔ ملتان کے احباب سے رابطہ رہا تاکہ وہاں بزم کا قیام جلد ہو۔

درج ذیل بزموں نے ۱۹ فروری تک رپورٹ نہیں بھیجی

پشاور (شہر اور چھاؤنی)۔ جھنگ (دکری)۔ حیدر آباد (ٹنڈو محمد خاں)۔ راولپنڈی۔ سرگودھا (چک ۷۱ شمالی) سیالکوٹ (چھاؤنی۔ جتی شیخاں۔ چونڈہ)۔ کراچی۔ لاہور شہر۔ لائلپور۔ مردان (حلہ ابتدائی بزمیں۔ بزم مردان خاص)

نوٹ۔ مذکورہ صدر بزموں کے اراکین کو چاہیئے کہ وہ نمائندگان سے تساہل پر باز پرس کریں۔

بزموں کی خریداری کے سلسلہ میں حسب ذیل رقوم مزید موصول ہوئی ہیں۔

۱۔ بزم مردان ۔	۱۰۰/۰ روپیہ
۲۔ بزم شیخوپورہ۔	۱۰/۰ روپیہ

(صدر کنونشن کمیٹی)

پرویز صاحب کے آئندہ دورے کا پروگرام

۹ مارچ۔ صبح روانگی بطرف ڈیرہ غازی خاں (براستہ ملتان)

۹ رشب ۔ ۱۰ کا پورا دن اور ۱۰ کی شب، قیام ڈیرہ غازی خاں

۱۱ صبح ۔ واپسی (براستہ ملتان)

مزید تفصیل کے لئے ـــــ

محترم مشتاق احمد چغتائی۔ ترجمان بزم طلوع اسلام صدر۔ ڈیرہ غازی خاں کو لکھئے۔

چند بصیرت افروز کتابیں

اسبابِ زوالِ امت

(دوسرا ایڈیشن) مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہماری حکمت کے زوال کے اسباب کیا ہیں اور ان کا علاج کیا؟ ۷۲ صفحات ۔ قیمت دو روپے

اسلامی معاشرت

(تیسرا ایڈیشن) مسلمانوں کی روزمرہ زندگی کے لئے قرآنی ارشادات ۔ بالخصوص عورتوں بچوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے اس سے بہتر کتاب آپ کو نہیں مل سکے گی۔

قیمت ۔ دو روپے

اقبال اور قرآن

علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ

۲۵۶ صفحات قیمت دو روپے

جشن نامے

ہم ہر سال جشن جمہوریہ منانے کی تیاریاں کرتے ہیں۔ مگر کیا ہر جشن اسی طرح منایا جائے گا۔ جیسے ہم ہر سال مناتے چلے آ رہے ہیں۔ ہمارے جشنوں کی تبسم فشاں درد انگیز تصویر ۲۵۶ صفحات ۔ قیمت دو روپے

مزاج شناسِ رسول

پیشوایانہ ڈکٹیٹرشپ کی راہیں کس طرح ہموار کی جا رہی ہیں۔ اسے سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ قیمت چار روپے

قرآنی فیصلے

روزمرہ زندگی کے ساٹھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن ہمیں کیا راہنمائی دیتا ہے اور ہم کیا کر رہے ہیں دین کے متعلق پُر از معلومات اور حقیقت کشا کتاب ہے

۴۰۸ صفحات قیمت چار روپے

اسلامی نظام

اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں۔ اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے۔ اس کے جواب میں محترم پرویز صاحب اور علامہ اسلم جیراجپوری ؒ کے مقالات کا مجموعہ۔ جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں

ضخامت ۱۸۰ صفحات ۔ قیمت دو روپے

اس پتہ سے منگوایئے

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵/بی گلبرگ کالونی ۔ لاہور

مجلسِ اقبال

مثنوی رموزِ بیخودی

در معنی اینکہ توسیع حیاتِ ملیہ از تسخیر قوائے نظامِ عالم است

مذہب (یعنی انسانوں کے خودساختہ عقائد و تصورات) کی رو سے، انسانی زندگی کا مقصود یہ ہے کہ "روح" کو مادی کثافتوں سے نجات دلائی جائے۔ اس تصور کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مادی کائنات کو قابلِ نفرت سمجھا جائے اور جہاں تک ہو سکے اس سے دور بھاگا جائے۔ یہ تصور آپ کو "ہر مذہب" میں بطور قدرِ مشترک ملے گا۔ قرآن نے مذاہبِ عالم کے دیگر باطل تصورات کی طرح، اس تصور کو بھی چیلنج دیا اور واضح الفاظ میں اس کی تردید کر دی۔ اس نے کہا کہ خدا نے کائنات کو قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے تاکہ انسان ان سے اپنا کام لے۔ یہی وہ "اسماء (قوانینِ فطرت)" ہیں جن کا علم "آدم" کو دیا گیا ہے۔ اسی علم سے وہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے اپنے کام میں لا سکتا ہے۔ لہذا ملتِ اسلامیہ کا بنیادی فریضہ یہ ہے کہ وہ کائنات کی قوتوں کو مسخر کرے اور ان کے ماحصل کو نوعِ انسان کی نشوونما کے لئے عام کر دے۔ زیرِ نظر باب میں علامہ اقبالؒ نے اس حقیقت کی وضاحت کی ہے اور بتایا ہے کہ ملتِ اسلامیہ کی حیات کی توسیع کا راز قوائے فطرت کی تسخیر میں ہے۔ اس سلسلہ میں وہ کہتے ہیں۔

ای کہ با نادیدہ پیماں بستہ
ہم چو سیل از قیدِ ساحل رستہ

تم نے اس خدا کے ساتھ پیمانِ وفا باندھا ہے۔ اپنا سلسلہ اس کے ساتھ جوڑا ہے، جو محسوس کائنات سے ماوراء ہے۔ یعنی وہ کائنات کی محسوس اشیاء میں سے ایک شے نہیں۔ اس خدا پر ایمان کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ تمہیں اس محسوس کائنات میں گم ہو کر نہیں رہ جانا چاہیئے۔ آگے

مسخر کرکے اس سے بلند ہو جانا چاہیئے۔

اس مقام پر اتنا اور سمجھ لینا ضروری ہے کہ جہاں انسانوں کے خود ساختہ مذاہب نے مادی کائنات کو قابلِ نفرت قرار دے کر اس سے دور بھاگنے میں نجات بتائی، مغرب کے تصورِ حیات نے انسان کو اسی مادی دنیا کا طبعی پیکر قرار دے کر اس کی زندگی کا منتہیٰ و مقصود، اس محبس آب و گل میں بند ہو کر رہ جانا بتایا۔ قرآن نے جہاں اوّل الذکر تصورِ حیات کی تردید کی وہاں اُس نے ثانی الذکر نظریۂ زندگی کو یہ کہہ کر باطل قرار دیا کہ انسان صرف طبعی جسم ہی سے عبارت نہیں۔ اس میں ایک اور شے (انسانی ذات) بھی ہے جو غیر مادی ہے اور نہ مادہ کے ساتھ فنا ہو سکتی ہے۔ انسانی زندگی کا مقصود یہ ہے کہ وہ مادی کائنات کو مسخر کرتا ہوا اپنی ذات کی نشوونما کرتا چلا جائے اور اس طرح مادہ کی چار دیواری سے باہر نکل کر حیاتِ جاوداں حاصل کرے۔ جب انسان اپنے سامنے یہ نصب العین رکھے گا تو ظاہر ہے کہ وہ ہر اس رکاوٹ کو، جو مادی دنیا میں اس کے سامنے آئے گی، ٹھکراتا ہوا آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ اس حقیقت کو علامہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

چوں نہال از خاکِ ایں گلزار خیز
دل بغائب بند و با حاضر ستیز

تمہیں چاہیئے کہ اپنے سامنے اس منزل کو بطور نصب العین رکھو جو مادی کائنات سے ماوراء ہے (یعنی اپنی ذات کی نشوونما سے حیاتِ جاوداں حاصل کر لینا) اس منزل تک پہنچنے کے لئے ضروری ہوگا کہ حاضر و موجودات سے مسلسل برسرِ پیکار رہا جائے اور اس طرح انسان اس سے یوں آگے نکل جائے جس طرح خاک کے اندر ملا ہوا دانہ، اپنے جوشِ نمو سے، زمین کی سطح کو پھاڑ کر اوپر اُبھر آتا ہے۔

ہستیٔ حاضر کند تفسیرِ غیب
می شود دیباچۂ تفسیرِ غیب

انسان مادی کائنات میں اس لئے نہیں آتا کہ اسی میں کھو کر رہ جائے۔ اس دنیا میں انسان کی حیاتِ طبعی، زندگی کے مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس زندگی کا ماورائے کائنات زندگی کی تفسیر ہوتی ہے۔

ماسوا از بہرِ تسخیر است و بس
سینۂ او عرضۂ تیر است و بس

یہ خارجی کائنات اس لئے وجود میں لائی گئی ہے کہ انسان اسے مسخر کرکے اپنی مضمر صلاحیتوں کو نشوونما دینے کا ذریعہ بنائے۔ یہ وہ (چاندماری) کی دیوار ہے جس پر تیر انداز اپنے نشانے کی مشق کرتا ہے۔ مادی کائنات کا مصرف اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ یہ انسانی صلاحیتوں کی پختگی کی آماجگاہ ہے۔

از کنِ حق ماسوا شد آشکار
تا شود پیکانِ تو سنداں گذار

خدا نے مادی کائنات کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ انسان اپنی صلاحیتوں کا امتحان (TEST) کرتا رہے کہ ان کی کس حد تک نشوونما ہو چکی ہے۔ یہ اہرن اس کے سامنے اس لئے رکھ دی ہے کہ وہ اپنے تیر کو اس کے آر پار کرے۔ اگر انسان کے سامنے اس قسم کے موانع نہ رکھے جاتے تو اسے اپنی قوت کا صحیح صحیح اندازہ ہی نہ ہو سکتا۔ کام کا مشکل اور دشوار ہونا، کام کرنے والے کی صلاحیتوں کے پرکھنے کا معیار بن جاتا ہے۔

رشتہ باید گرہ اندر گرہ

تا شود لطف کشودن را فرہ

اگر دھاگے میں کوئی گرہ ہی نہ ہو تو ناخنِ تدبیر کی صلاحیت گرہ کشائی کا پتہ ہی نہ چل سکے۔ دھاگے میں جتنی زیادہ گرہیں ہوں لطفِ گرہ کشائی اتنا ہی زیادہ ہو جاتا ہے۔

غنچۂ از خود چمن تعمیر کن

شبنمی؛ خورشید را تسخیر کن

اگر تو ننھی سی کلی ہے تو تجھے صحنِ چمن کائنات میں گم ہو کر نہیں رہ جانا چاہیئے۔ پورے کا پورا چمن تیرے اندر سمویا ہوا ہونا چاہیئے۔ اگر تو شبنم کا قطرہ ہے تو تجھے اپنے آپ کو حقیر و ناتواں نہیں سمجھنا چاہیئے۔ تجھے اُبھر کر خورشید کو مسخر کر لینا چاہیئے۔ کائنات کی کوئی شے انسان سے زیادہ طاقتور نہیں ——— تمام ملائکہ آدم کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔

از تو می آید اگر کارِ شگرف

از دمے گرمے گدازاں شیر برف

یہ مادی کائنات بظاہر بڑی سخت اور مہیب دکھائی دیتی ہے۔ لیکن انسان کے سامنے اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔ یہ برف کا شیر ہے جو سورج کی کرنوں سے خود بخود پگھل کر معدوم ہو جاتا ہے۔ نادرہ کار انسان، بڑے سے بڑے پہاڑ کو پانی کی طرح بہا کر رکھ دیتا ہے۔

ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد

عالمے از ذرۂ تعمیر کرد

جس نے اس مادی کائنات کو مسخر کر لیا اس نے اپنے اندر اتنی قوت پیدا کر لی جس سے وہ ایک ذرے سے جہانِ نو کی تخلیق پر قادر ہو سکتا ہے۔

آنکہ تیرش قدسیاں را سینہ خست	اوّل آدم را سر فتراک بست
عقدۂ محسوس را اوّل کشود	ہمت از تسخیرِ موجود آزمود

پہلے شعر میں "آنکہ" اور "تیرش" کا اشارہ کس کی طرف ہے، یہ بات زیادہ واضح نہیں۔ لیکن قرائن سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ کا اشارہ خود انسان ہی کی طرف ہے۔ یہی انسان تھا جو مسجودِ ملائکہ بنا اور اس کی فضیلت کے تیر سے ان کا سینہ چھد!—

انسان عبارت ہے اس کے جوہر (ذات) اور مادی جسم سے۔ انسان کا فریضہ یہ ہے کہ وہ پہلے خود اپنے مادی جسم کو مسخر کرے اور اسے قوانین خداوندی کے تابع چلائے۔ اس کے بعد وہ خارجی کائنات کی طرف متوجہ ہو اور عالمِ محسوسات کی تسخیر سے اپنی ہمتوں کا (TEST) کرتا چلا جائے۔ یہ اس کی ہمت ہے جس سے کائنات کے سربستہ راز دن بدن کھلتے چلے جاتے ہیں۔ انسان نہ ہوتا تو یہ عقدے کبھی وا نہ ہوتے۔

کوہ و صحرا دشت و دریا بحر و بر

تختۂ تعلیمِ اربابِ نظر

قرآن واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں۔ رات اور دن کے اختلاف میں۔ چاند اور سورج کی گردش میں۔ پہاڑوں کے طبقات میں۔ موسموں کی خوئے انقلاب میں۔ غرضیکہ عالمِ محسوسات کے ذرہ ذرہ میں اربابِ علم و بصیرت کے لئے آیات ہیں۔ کتابِ فطرت قوانین الٰہیہ کی کارفرمائی کی کھلی ہوئی شہادت ہے۔ لیکن صرف انہی کے لئے جو دیدۂ بینا سے اس کا مطالعہ کریں۔

لیکن افلاطون کے نظریہ سے متاثر تصوف نے خود مسلمانوں کے ذہن میں بھی اس خلافِ قرآن تصور کو جاگزیں کر دیا کہ مادی کائنات قابلِ نفرت ہے۔ یہی وہ افیون ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علامہ، مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ

ایکہ از تاثیرِ افیون خفتہٗ	عالمِ اسباب را دوں گفتہٗ
خیز و واکن دیدۂ مخمور را	دوں مخواں ایں عالمِ مجبور را

تم نے بھی افلاطونی تصوف کی افیون سے متاثر ہو کر دنیا کو قابلِ نفرت تصور کرنا شروع کر دیا۔ اس نشے سے آنکھ کھولو اور کائنات کو شر (EVIL) مت قرار دو۔ اسے حقیر اور باطل نہ سمجھو۔ یہ ایک حقیقت ہے جس پر بڑی سنجیدگی سے (SERIOUSLY) غور کرنے کی ضرورت ہے۔

غایتش توسیعِ ذاتِ مسلم است

امتحانِ ممکناتِ مسلم است

مادی کائنات باطل پیدا نہیں کی گئی۔ اس کی تخلیق کا خاص مقصد ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ اس سے انسان اپنی صلاحیتوں کا امتحان لیتا رہے کہ وہ کس حد تک ممکن (REAL-ISEABLE POSSIBILITIES) سے مشہود (ACTUALISED) ہو گئی ہیں۔ اس سے ایک عبدِ مومن کی ذات کی توسیع ہوتی ہے۔

می زند شمشیرِ دوراں بر تنت

تا ببینی ہست خوں اندر تنت

یہ مادی کائنات، دمبدم وقت (TIME) کی تلوار، تیرے بدن پر مارتی رہتی ہے، تاکہ تو دیکھ لے کہ تیری رگوں میں خون

موجود ہے اور اس میں صرت اور قوت کس قدر ہے۔

سینہ را از سنگ زور ریش کن

امتحانِ استخوانِ خویش کن

سفرِ ہستی میں جو سنگ گراں بار راستے میں آئے، اس سے ٹکر لینی چاہیئے اور اس طرح دیکھنا چاہیئے کہ تمہاری ہڈیوں میں کس قدر قوت پیدا ہو چکی ہے۔

حق جہاں را قسمتِ نیکاں شمرد

جلوہ اش با دیدۂ مومن سپرد

قرآن میں واضح الفاظ میں کہہ دیا گیا ہے کہ ایمان و اعمالِ صالح کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہے اس لئے دنیا مومن کی وراثت ہے۔ لہٰذا جو کائنات کو مسخر نہیں کرتا وہ مومن نہیں۔

کاروان را رہگذار است ایں جہاں

نقدِ مومن را عیار است ایں جہاں

انسانی ذات کا جو کارواں اپنی منزلِ مقصود کی طرف جا رہا ہے، یہ دنیا اس کے لئے راہ گذار ہے۔ اسے اس راستے پر سے گذرنا ہوگا۔ اسے طے کرنا ہوگا۔ یہی وہ کسوٹی ہے جس پر مومن کے ایمان و عمل کو پرکھا جا سکتا ہے۔ اگر یہ دنیا اس کے تابع فرمان ہو گئی تو وہ صحیح معنوں میں مومن ہے۔ اگر وہ مادی کائنات سے دب گیا تو نہ اس کا ایمان، ایمان ہے۔ نہ اعمال، اعمالِ صالح۔ اس لئے

گیر او را تا نہ او گیرد ترا

ہم چو مے اندر سبو گیرد ترا

اگر تم چاہتے ہو کہ دنیا تمہیں اپنے اندر اس طرح محبوس نہ کرے جس طرح صراحی، شراب کو مقید کر لیتی ہے تو اس کا طریق یہ ہے کہ تم دنیا پر غالب رہو۔ کائنات کو مسخر کرو۔ اگر تم اس سے دب گئے تو تمہاری تمام انسانی صلاحیتیں دب کر رہ جائیں گی۔

دلدلِ اندیشہ ات طوطی پر است   آنکہ گامش آسماں پہنا درست

احتیاجِ زندگی میراندش   بر زمیں گردوں سپر گرداندش

فطرت کی طرف سے انسانی فکر کو اس قدر قوتِ پرواز عطا ہوئی ہے کہ فضائے آسمانی اس کے سامنے کوئی شے نہیں لیکن ضروریاتِ زندگی کی احتیاج اسے پٹک کر اس طرح زمین پر دے مارتی ہے کہ اس میں راڑنا تو ایک طرف، اٹھنے تک کی سکت باقی نہیں رہتی۔

تا ز تسخیرِ قوائے ایں نظام

ذوفنونیہائے تو گردد تمام

انسان کے اندر گوناگوں قوتیں اور متنوع صلاحیتیں ہیں۔ ان قوتوں کی تکمیل تسخیر کائنات سے ہوتی ہے۔

نائب حق در جہاں آدم شود
بر عناصر حکم او محکم شود

اس طرح، کائنات کے عناصر پر حکمرانی سے انسان، نائب حق بن جاتا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی کئی ایک مقامات پر لکھ چکے ہیں، یہ تصور کہ انسان، خلیفۃ اللہ فی الارض ہے، قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ انسانؔ قوانینِ خداوندی کے تابع زندگی بسر کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے جس سے اس کی قوتیں اس قدر بیدار ہو جاتی ہیں کہ ان سے یہ اس دنیا کو بھی مسخر کر لیتا ہے اور اس زندگی سے اگلی زندگی کے ارتقائی مراحل طے کرلینے کے قابل بھی ہو جاتا ہے۔ یہی انسان کی صحیح پوزیشن ہے۔

تنگی ات پہناں پذیرد در جہاں
کار تو اندام گیرد در جہاں

تسخیر کائنات سے انسان کی ذات میں وسعتیں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اسی سے اس کا ہر کام سنورتا ہے۔

خویش را بر پشت باد اسوار کن
یعنی ایں جمازہ را ما بار کن

زمین تو ایک طرف، تجھے چاہیئے کہ ہوا پر سواری کرے اور اس اونٹنی کو مہار دے کر اپنے ارادوں کے مطابق چلائے۔

دست رنگیں کن ز خونِ کوہسار
جوئے آب گوہر از دریا بر آر

تیرے تیشہ سے پہاڑوں کے جگر شق ہو جانے چاہئیں۔ تیری غواصی سے سمندر کی گہرائیوں سے جواہرات کی ندیاں رواں ہو جانی چاہئیں۔

صد جہاں در یک فضا پوشیدہ اند
مہر ہا در ذرہ ہا پوشیدہ اند

کائنات کی ایک ایک فضا میں سینکڑوں دنیائیں پوشیدہ ہیں۔ یہاں کے ایک ایک ذرہ میں ہزاروں خورشید پنہاں ہیں۔

از شعاعش دیدہ کن نادیدہ را
وانما اسرار نافہمیدہ را

تجھے چاہیئے کہ کائنات کی ان مضمر قوتوں کو محسوس و مشہود بنا دے۔ فطرت کے پردوں کو چاک کر دے، اس کے رازہائے سربستہ کو بے نقاب کر دے۔

تابش از خورشید عالمگیر گیر
برق طاق افروز از سیلاب گیر

سورج کی شعاعوں سے روشنی اور توانائی نچوڑ لے۔ پانی کے طوفان میں چھپی ہوئی بجلیوں کو قمقموں میں مسخر کر دے تاکہ اندھیرے کا نام و نشان باقی نہ رہے۔

ثابت و سیارۂ گردوں وطن   آں خداوندانِ اقوامِ کہن
ایں ہمہ اے خواجہ آغوشِ تو اند   پیشِ خیزد حلقہ در گوشِ تو اند

آسمان کے ستارے اور سیارے، کہ زمانہ گذشتہ کی قومیں جنہیں اپنا خدا سمجھ کر ان کے حضور سجدہ ریز ہوتی تھیں۔ ان کی حقیقت یہ ہے کہ انسان ان کا آقا ہے اور یہ سب اس کے غلام اور لونڈیاں۔ یہ حاکم ہے اور فضائی کرے اس کے محکوم۔

جستجو را محکم از تدبیر کن
انفس و آفاق را تسخیر کن

تجھے چاہیئے کہ کائنات کے گوشے گوشے میں ریسرچ جاری رکھے۔ اور یہ سب کچھ خاص اسکیم (PLANNING) کے مطابق ہو۔ اس طرح عالم انفس و آفاق کو مسخر کرتا چلا جائے۔

چشم خود بکشا و در اشیا نگر   نشہ زیر پردۂ صہبا نگر
تا نصیب از حکمتِ اشیا برد   ناتواں باج از توانایاں خورد

ریسرچ کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی آنکھیں اشیائے کائنات کی گہرائیوں تک پہنچ جائیں اور ہر شے کے عناصر ترکیبی۔ ماہیت۔ کیفیت خواص و اثرات بے نقاب ہو کر سامنے آجائیں اور اس طرح نوع انسان ان اشیاء سے صحیح صحیح اور پورا پورا فائدہ اٹھا سکے۔ اور یوں جن عناصر کو کبھی (جہالت اور توہم پرستی کی بنا پر) "خدا" سمجھا جاتا تھا (اور انسان کو ان کا بندہ) وہ انسان کی باجگذار بن جائیں۔

صورتِ ہستی ز معنی سادہ نیست
ایں کہن ساز از نوا افتادہ نیست

یاد رکھیئے۔ کائنات یونہی بلا مقصد نہیں پیدا کی گئی۔ نہ ہی یہ پُرانی ہونے کی وجہ سے اپنی پٹڑی سے اکھڑ کر کسی اور سمت کی طرف چل رہی ہے۔ اس کا ایک مقصد ہے اور یہ برابر اس سمت کی طرف جا رہی ہے۔

برق آہنگ است ہشیار ش زنند
خویش را چوں زخمہ بر تارش زنند

اس کے ساز کہن میں بجلی کی سی آواز پوشیدہ ہے۔ جو ارباب فکر و بصیرت اس حقیقت سے واقف ہیں وہ خود مضراب بن کر اس پر گرتے ہیں اور بڑی چابکدستی سے اس کے تاروں میں خوابیدہ نغموں کو بیدار کرتے ہیں۔

ترکِ مقصود و خطابِ منظری
نیست چون ایں راہ چوں کوراں بری

مسلمان کو خدا نے حکم دیا تھا کہ کائنات پر آنکھیں کھول کر غور و تفکر کرو۔ حیرت ہے کہ اس کے باوجود تم اس راستے پر آنکھیں بند کر کے اندھوں کی طرح چلے جاتے ہو؟

قطرہ کز خود فروزی محرم است
بادہ اندر تاک و برگل شبنم است

جو قطرہ آب، اپنی ذات کی جلوہ فروزیوں سے باخبر ہے وہ اپنے آپ کو کبھی ہیچ نہیں سمجھتا۔ وہ اگر رگِ تاک میں جذب ہوتا ہے تو شراب بن جاتا ہے اور پھول کی پتی پر گرتا ہے، تو شبنمی آویزہ بن کر چمکتا ہے۔

چوں بدریا در رود گوہر شود
جوہرش تابندہ چوں اختر شود

اگر وہ قطرہ دریا کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے تو وہاں سے گوہر آب دار بن کر نمودار ہوتا ہے اور اس طرح طاقِ گیتی میں ستاروں کی طرح چمکتا ہے۔

چوں صبا بر صورتِ گلہا متن
غوطہ اندر معنیٔ گلزار زن

تمہیں اشیائے کائنات پر سطحی نظر ڈال کر آگے نہیں گذر جانا چاہیئے۔ ہر شے کی حقیقت کی جستجو کرنی چاہیئے۔

آنکہ بر اشیا کمند انداخت است
مرکب از برق و حرارت ساخت است

جو قوم اشیائے کائنات کو مسخر کر لیتی ہے وہ بجلیوں اور حرارتوں پر سوار ہو جاتی ہے۔

حرف چوں طائر بہ پرواز آورد
نغمہ را بے زخمہ از ساز آورد

وہ قوم حروف (LETTERS) کو فضا کی پہنائیوں میں اڑا کر، لاسلکی (WIRELESS) کے ذریعہ پیغام رسانی کرتی ہے۔ اور ساز میں چھپے ہوئے نغمات کو، بے منتِ مضراب، فردوسِ گوش بنا دیتی ہے۔

اے خرت لنگ از رہِ دشوار زیست | غافل از ہنگامۂ پیکارِ زیست
ہمرہانت پے بہ منزل بردہ اند | لیلیٔ معنی ز محمل بردہ اند
تو بصحرا مثلِ قیس آوارۂ | خستۂ۔ واماندۂ۔ بیچارۂ

اے قومِ مسلم، تو سفرِ ہستی میں گدھے پر سوار ہے۔ اور گدھا بھی ایسا جو راستے کی دشواری سے لنگڑا ہو چکا ہے۔ اس کے مقابل، دیگر اقوامِ عالم، برق رفتاری سے جانبِ منزل رواں دواں چلی جا رہی ہے۔ انھوں نے مقصود کو حاصل بھی کر لیا ہے اور تم صحرا میں مجنوں کی طرح آوارہ و سرگرداں پھر رہے ہو۔ ذرا سوچو کہ اس طرح، قوموں کے آگے آگے چلنا تو ایک طرف، تم ان کے دوش بدوش بھی نہیں چل سکتے۔ سفرِ ہستی کا قانون یہ ہے کہ جو مسافر پاؤں سے کانٹا نکالنے کے لئے بھی پیچھے رہ گیا، تیز گام راہرو اسے کچل کر آگے بڑھ جائیں گے۔ ان حالات کے پیشِ نظر اس امر کا فیصلہ تم خود کرو کہ تم، ان اقوام کے مقابلہ میں، کب تک ٹھہر سکو گے۔ یاد رکھو۔

علمِ اسماء اعتبارِ آدم است
حکمتِ اشیاء حصارِ آدم است

اگر تم نے اشیاءِ کائنات کو مسخر نہ کیا تو تم دنیا میں کبھی زندہ نہیں رہ سکو گے۔ مومن کا مقام تو خیر بہت بلند ہے۔ تم صفِ آدمیت میں کھڑے ہونے کے بھی قابل نہیں ہو سکو گے۔ اس صف میں کھڑے ہونے کے قابل وہی ہو سکتا ہے جو اشیائے کائنات کو مسخر کر لے۔ یہی وہ قلعہ ہے جس کے اندر انسان کو تباہیوں سے پناہ مل سکتی ہے

اقبال و قرآن

از پرویز

علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفرین مقالات کا مجموعہ

قیمت:۔ ڈیڑھ روپیہ

ملنے کا پتہ:۔
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۔ ۲۵۔ بی ۔ گلبرگ کالونی ۔ لاہور

تفسیر المنار

(۲)

سورۂ بقرہ

قرآن مجید "بیان" بھی ہے اور "تبیین" بھی — سورۂ بقرہ کے مضامین کو اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہوئے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۙ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ○

جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی بینات وہدایت کو اس کے بعد کہ ہم نے لوگوں کے لئے اس کی "تبیین" کتاب میں کر دی چھپاتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ "لعنت" کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے ان پر "لعنت" کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا آیت کے ضمن میں علامہ عبدہٗ اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایات وبینات کو لوگوں کے لئے کتاب میں خود ہی بیان فرما دیا ہے اور اس کی تبیین (وضاحت) بھی کر دی ہے (صفحہ)

[اس طرح انہوں نے اس خیال کی تردید کر دی ہے جس کے مطابق کہا جاتا ہے کہ قرآن "بیان" ہے "تبیین" نہیں۔ تبیین کے لئے منزل کتاب کے علاوہ کچھ اور بھی درکار ہے۔]

کسی چیز کو حرام یا حلال قرار دینا صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے — اللہ تعالیٰ نے مومنین کو ہر قسم کے طیبات (یعنی بھلی اور خوشگوار پاکیزہ چیزیں) کھاتے اور اس پر شکر ادا کرتے رہنے کا حکم دیا ہے اور تمام کھانے کی چیزوں میں سے صرف "الْمَيْتَةَ" (مردار) "الدَّمَ" خون۔ "لَحْمَ الْخِنزِيرِ" سور کا

گوشت - مَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۔ وہ چیزیں جن پر غیر اللہ کا نام لیا جائے، حرام قرار دی ہیں۔ ان میں بھی مجبوری اور اضطراری حالت والا استثنیٰ ہے۔ یعنی اگر کسی کی زندگی بچنے کی صرف یہی صورت ہو کہ وہ ان میں سے کوئی چیز کھائے تو وہ حد سے تجاوز کئے بغیر ضرورت بقدر سد رمق کے لئے استعمال میں لا سکتا ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے کلیات دین کے ضمن میں حرام چیزوں کی یہ فہرست بیان فرما کر مشرکین و اہل کتاب کے ان اختیارات کو باطل قرار دیا ہے جن کی رو سے وہ اپنی مرضی سے جن چیزوں کو چاہتے حلال یا حرام کر لیتے۔ اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر حصر کے ساتھ بیان فرمایا کہ کسی چیز کو حلال یا حرام کرنے کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ پھر اس آیت کے بعد مزید تنبیہ کے لئے يَكْتُمُوْنَ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ کی وعید بھی نازل فرمائی۔ ص

دوسری جگہ مزید تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

تمام کھانے کی پاکیزہ چیزیں جنہیں طبع انسانی گوارا کرے حلال ہیں۔ اور کسی غیر اللہ کو اس کی اجازت نہیں کہ وہ اللہ کی حرام کردہ چیزوں میں سے کسی کو حلال قرار دے دے یا ان میں کسی قسم کا رد و بدل یا اضافہ کرے۔ چنانچہ ارشاد ہے:-

يَا اَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا (۲/۱۶۸)

اے لوگو! جو کچھ زمین میں ہے اس میں سے حلال و طیب کھاؤ۔

اور:

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ (۲/۱۷۲)

اے ایمان والو! ان خوشگوار پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تم کو دی ہیں۔

اور اسی آیت کے بعد فرمایا:-

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ (۲/۱۷۳)

بیشک اس نے تو تم پر صرف مردار اور خون اور سور کا گوشت حرام کیا ہے اور وہ چیز جس پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے۔

چنانچہ اس طرح صرف چار چیزوں کو حرام قرار دیدیا، اسی مضمون کی تائید سورۂ انعام، سورۂ نحل کی مکی سورتوں میں پائی جاتی ہے سورۂ مائدہ میں جو مدنی ہے اَلْمَيْتَةَ کی تفصیل ہیں

(۱) اَلْمُنْخَنِقَةُ گلا گھونٹنے کی وجہ سے مرنے والی۔

(۲) اَلْمَوْقُوْذَةُ چوٹ یا مار لگنے کی وجہ سے مرجانے والی۔

(۳) اَلْمُتَرَدِّيَةُ اوپر سے گر کر مرجانے والی۔

(۴) اَلنَّطِیۡحَةُ سینگ یا ٹکر لگنے سے مرجانے والی۔

(۵) مَآ اَکَلَ السَّبُعُ درندوں کے کھالینے کی وجہ سے مرجانے والا۔

کی تفصیل بیان فرمادی ہے، یہ جانور بھی اس صورت میں حرام ہیں جبکہ مرجائیں، لیکن اگر موت سے پہلے انھیں انسان پالے اور حلال کرلے تو حرام نہیں ہوں گے، اسی طرح سورۂ انعام کی آیت میں "اَلدَّمُ" کے ساتھ "اَلۡمَسۡفُوۡحُ" کی قید ہے یعنی "بہتا ہوا خون" (ص۱۱۳)

دین کیا ہے؟

سورۂ البقرہ میں سفری اصول و قواعد کے ضمن میں پہلا قاعدہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔
اللہ نے اپنے رسولوں پر وحی کے ذریعہ جو ہدایت نازل فرمائی وہی دین ہے اسی کی اتباع ہونی چاہیئے اور ایسے لوگوں کے لئے جو اتباع ما انزل اللہ کرتے ہیں نہ خوف ہے نہ وہ رنج کریں گے۔ ص۱۱۱

امت کی وحدت صرف وحی الٰہی کے اتباع ہی کا نتیجہ ہے بصورتِ دیگر انتشار و اختلاف کا دروازہ کھلا رہے گا

حقیقی ایمان اور امت کی وحدت کے لئے اللہ کی طرف سے نازل شدہ تعلیمات کو مضبوط تھامنا، اور اس پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔ وحی الٰہی سے رہنمائی ترک کردینے کا انجام اختلاف و فرقہ بندی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

فَاِنۡ اٰمَنُوۡا بِمِثۡلِ مَاۤ اٰمَنۡتُمۡ بِهٖ فَقَدِ اهۡتَدَوۡا ۚ وَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا هُمۡ فِىۡ شِقَاقٍ (۲/۱۳۷)

تو اگر یہ لوگ اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لائے تو انھوں نے راہ پالی اور اگر یہ اس سے روگردانی کریں تو یہ لوگ اختلاف و شقاق میں ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَـقِّ ؕ وَاِنَّ الَّذِيۡنَ اخۡتَلَفُوۡا فِى الۡكِتٰبِ لَفِىۡ شِقَاقٍۢ بَعِيۡدٍ (۲/۱۷۶)

یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور جن لوگوں نے کتاب میں اختلاف کیا وہ حق سے بہت دور کردینے والے شقاق میں ہیں۔

برّ یا نیکی قاعدہ اور اصول کے مطابق کام کرنے کا نام ہے

"گھروں میں دروازوں سے آؤ نہ کہ پچھواڑوں سے" اس کے معنی یہ ہیں کہ چیزوں کو ان کے صحیح ذرائع و وسائل اور مناسب اسباب سے حاصل کرو اور کاموں کو غلط طریقوں کے بجائے ان کے صحیح طریقوں سے انجام دو۔ عادت کو عبادت نہ بناؤ، عبادت کو عادت نہ بناؤ۔ اسی طرح دنیاوی منفعت کو دینی نصوص سے حاصل نہ کرو جیسا کہ قائم تفتیش

نے فرمایا

أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأَمْرِ دُنْيَاكُمْ

تم اپنے دنیوی معاملات مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔

کامیابی کے اسی اصول کو مندرجہ ذیل آیت قرآنی وضاحت سے بتا رہی ہے۔

لَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَىٰ وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا (۲/۱۸۹)

نیکی یہ نہیں کہ تم گھروں میں ان کے پچھواڑے سے آؤ بلکہ نیک وہ ہے جس نے تقویٰ اختیار کیا، اور گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ

زراعت و تجارت، صنعت و فنونِ حرب کے آلات و اوزار اور ہتھیار وغیرہ ہی وہ دروازے ہیں جن کے ذریعہ ان کاموں کو صحیح شکل میں انجام دیا جا سکتا ہے اور وہی ان تک پہنچے گا اور کامرانی حاصل کرے گا جو ان ہی دروازوں سے داخل ہوگا۔

دین جن عقائد عبادات و آداب کی تعلیم دیتا ہے اور جن چیزوں کو حلال یا حرام قرار دیتا ہے ان کے جاننے پہچاننے کے اصول و قواعد کتاب اللہ میں موجود ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل نے ان کو عملی شکل میں بیان فرما دیا، اسی طرح دین میں سیاسی قوانین سازی کے لئے بھی نصوص قرآنی اور اجتہاد کے معروف طریقے ہیں جن کے ذریعے متعلقہ امور کی مشکلات پر قابو پایا جا سکتا ہے لیکن بعض کچھ غلط طریقے رائج ہو گئے ہیں۔ مثلاً مقابلہ میں دشمن پر فتح و غلبہ حاصل کرنے کے لئے بجائے مقدور بھر قوت و طاقت جمع کرنے کے مسجدوں میں بخاری شریف کے ختم کرائے جاتے ہیں۔ مشکلات پر قابو پانے کے لئے یہ طریقہ خدا کے بیان کردہ اصول کے سراسر خلاف ہے صحیح طریقہ یہی ہے کہ ہر کام کے لئے اپنی امکانی قوت و طاقت جمع کر لی جائے پھر خدا سے دعا کی جائے کہ دعا بھی معنوی قوت کا ایک ذریعہ ہے۔ (صفحہ ۱۱۲)

اتباع ما انزل اللہ کی راہ میں ہمیشہ تقلید حائل رہی ہے

دین کے بنیادی اصولوں میں سے ایک اصل عظیم آباء و اجداد، علماء و رؤسا، مشائخ اور پیروں کی تقلید کا خاتمہ کرنا ہے، اس لئے کہ تقلید جہالت اور تعصب ہے۔ قرآن مجید میں سورۂ بقرہ کے علاوہ بھی تقلید کی ممانعت اور اس کو غلو قرار دینے کے لئے متعدد آیات ملتی ہیں، مثلاً وہ آیت جس میں وہ لوگ جن کی اتباع کی گئی اپنے متبعین سے اظہار برأت کرتے ہیں ——— (۲/۱۶۶-۱۶۷)

اور آیت مندرجہ ذیل:-

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۗ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ (۲/۱۷۰)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ما انزل اللہ کی اتباع کرو تو وہ کہتے ہیں، نہیں، بلکہ ہم تو اسی کی اتباع کریں گے جس پر ہم نے

اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے، کیا انسان کے آباؤ و اجداد کچھ بھی عقل نہ رکھتے ہوں اور بے راہ ہوں تو بھی یہ انہی کی اتباع کریں گے؟

یقیناً اللہ تعالیٰ نے تقلید کو حرام قرار دیا ہے کہ نیز کتاب اللہ میں یہ تصریح فرما کر کہ اللہ تعالیٰ تقلید کو قبول نہیں فرمائے گا۔ نہ آخرت میں مقلد کو معذور و قابل معافی سمجھے گا بالواسطہ ہر ایک کے لیے خود اعتقادی کے ساتھ دین کا استدلالی علم سیکھنا فرض قرار دیا ہے، اس قسم کے دینی علم سے یہ مراد نہیں کہ ہر شخص عوام و خواص کی تمام ضروریات کے مسائل کا استنباط یا آزادانہ اجتہاد بھی کر سکے۔

اسلامی دور کے قرون وسطیٰ میں مقلد مصنفین نے اس شرط کی وجہ سے کہ ہر مجتہد میں آزادانہ قانون سازی کی قابلیت ہونی چاہیئے استدلال سے روک کر مجتہدین کی تقلید واجب قرار دے کر دین اللہ کے خلاف نہایت جسارت پر مبنی فیصلہ کیا ہے جس کا مطلب کتاب اللہ کو ناقابل عمل بنا کر منسوخ کر دینا اور اللہ کی مقررہ حدبندیوں سے ہٹ کر اپنا قانون بنانا ہے ان کے اس عمل کا خلاصہ یہ ہے کہ علم کو حرام اور جہالت کو فرض کر دیا جائے، اس سے زیادہ عقل و فطرت کو مسخ کرنے اور اسلام کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ پھینکنے کی اور کونسی کارگر کوشش کی جا سکتی ہے، یہی وہ علت العلل ہے جو ان بدعات و خرافات کو پروان چڑھانے میں ممد و معاون ہیں جنھیں اسلام ختم کرنے کے لئے آیا تھا (صفا!!)

اصل اور بنیادی قوانین وہی ہو سکتے ہیں جو نص قطعی وصریح سے ثابت ہوں

تغیرات زمانہ سے بدلنے والے اجتہادی احکام جو روایتاً و دلالۃً کسی قطعی اور صریح نص سے ثابت نہ ہوں انھیں عام لازمی قانون نہیں بنایا جا سکتا۔ ایسے امور کا تعلق اگر عوام کی شخصی عبادات اور ان سے مخصوص دینی تحریم سے ہو تو انھیں انفرادی طور پر ان میں اجتہاد کا حق دیا جائے گا اگر سیاسی عدالتی امور سے متعلق ہوں تو انھیں اولی الامر اور ارباب حل و عقد حکام کو اجتہاد کے لیے تفویض کیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں ماخذ یہ آیت ہے:۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۖ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا
أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا (۲/۲۱۹)

یہ لوگ آپ سے شراب اور جوے کے متعلق دریافت کرتے ہیں، آپ کہہ دیجیئے کہ ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے اور لوگوں کے لئے فائدے بھی ہیں، اور ان کی خرابی ان کے نفع سے بڑھی ہوئی ہے۔

یہ آیت شراب اور جوے کو ایک قسم کے استدلالی اجتہاد کے ذریعہ حرام کر رہی ہے اور اس میں کہا یہ جا رہا ہے کہ جس چیز کا تخریبی پہلو (مضرت و اثم) اس کے تعمیری پہلو اور منفعت پر غالب آ جائے یا زیادہ ہو جائے وہ حرام ہے اور اس سے اجتناب واجب ہے، اور یہی وہ مفہوم ہے جسے بعض صحابہؓ اس آیت سے سمجھے اور انھوں نے شراب اور جوے سے اجتناب کر لیا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اجتناب تمام امت کے لئے لازمی قرار نہیں دیا۔ بلکہ شراب اور جوے کو ترک کرنے والوں اور نہ ترک کرنے والوں کو ان کی اجتہادی بصیرت پر چھوڑ دیا تا آنکہ سورۂ مائدہ کی وہ آیت اتری جو ان دونوں چیزوں (خمر و میسر) کی تحریم اور ان سے اجتناب کا حکم دینے کے

نص قطعی و صریح ہے، اجماع کے بعد انفرادی اجتہاد ختم کر دیا گیا، اور ہر صحابی نے اپنی شراب کا ذخیرہ انڈیل دیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بعد سے شراب پینے والے کو سزا دینے لگے۔

یہی وہ اصول ہے جس پر کاربند رہنے کی وجہ سے امت کے اسلاف اپنے ان مخالفین کو ناقابل گرفت اور معذور خیال کرتے تھے۔ جو بعض احادیث اور روایتیا ور ایسا غیر قطعی اجتہادی آثار ہیں ان سے مخالفت کرتے تھے اور ان کے ساتھ بعد میں آنے والے مقلدین حضرات کی طرح متشددانہ رویہ اختیار نہ کرتے تھے جن کا یہ شیوہ ہو گیا ہے کہ اپنے اجتہاد کو ہر ایک کے لئے لازم قرار دیتے ہیں۔

اور یہی وہ اصول ہے جسے مدنظر رکھتے ہوئے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اولاً خلیفہ منصور اور اس کے بعد خلیفہ ہارون الرشید کی اس پیشکش کو منظور نہ کیا کہ وہ تمام مسلمانوں کے لئے امام موصوف کی تصنیفات پر عمل پیرا ہونا لازمی قرار دیدیں حتیٰ کہ انھوں نے یہی گوارا نہ کیا کہ ان کی مشہور عام احادیث کے مجموعہ کی کتاب "موطا" جس میں امام موصوف نے اپنی صوابدید کے مطابق صحیح ترین مرفوع احادیث اور آثار صحابہؓ یکجا کئے ہیں اسے قانونی حیثیت دیدی جائے حالانکہ ان کی اس کتاب کی صحت پر ان کے زمانہ کے جمہور علماء متفق تھے۔ (صفحہ ۱۱۹)

تقویٰ

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ۝ میں متقین اتقاء سے ہے جس کا اسم "تقویٰ" ہے، اس کا مادہ "وقی" ہے، اسی سے "الوقایۃ" ہے جس کے معنی ہیں ضرر چیز سے بچنا، ہٹنا اور دور ہونا، یا اس سے بچاؤ اور حفاظت کرنا، اور مدافعت کرنا، لیکن ہم یہ لفظ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ سے منسوب پاتے ہیں مثلاً - فَاتَّقُونِ "مجھ سے تقویٰ کرو" اور - وَاتَّقُوا اللَّهَ "اللہ سے تقویٰ کرو" اور "وَاتَّقُونِ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ - اے ارباب عقل و دانش مجھ سے تقویٰ کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ"

اللہ سے تقویٰ کے معنی ہیں اس کے عذاب و عتاب سے بچنا اور دور رہنا۔ اللہ کے عذاب و عتاب کی اہمیت کے پیش نظر لفظ تقویٰ اللہ سے منسوب کیا گیا ہے ورنہ کسے مجال ہے کہ وہ ذات باری تعالیٰ سے بچ سکے یا اس کی قدرت و مشیت کے تابع نہ رہے۔

اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچاؤ کی شکل یہی ہے کہ جن چیزوں سے اس نے منع کیا ہے ان سے اجتناب کیا جائے اور جن امور کا اس نے حکم دیا ہے ان پر عمل درآمد کیا جائے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ عذاب اور عتاب دینے والے (یعنی غلط اعمال کے تباہ کن نتائج) کا خوف موجود ہو، الغرض متقی وہ ہے جو اپنے آپ کو خدا کے عتاب اور سزا سے بچائے، لہٰذا اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس علم و نظر ہو جس کے ذریعہ وہ عتاب و آلام کے اسباب معلوم کر کے ان سے بچ سکے۔

عتاب الٰہی جس سے لوگوں کو بچنا چاہیے دو قسم کا ہے ایک دنیوی دوسرا اخروی، اور ہر دو سے بچنے اور محفوظ رہنے کا طریقہ یہی ہے کہ ان کے اسباب و ذرائع سے بچا جائے، اور یہ اسباب و ذرائع دو قسم کے ہیں۔ اولاً یہ کہ اللہ کے دین اور اس کی شریعت کی مخالفت کی جائے ثانیاً یہ کائنات میں خدا کے مقررہ قوانین و قواعد کی مخالفت کی جائے۔

آخرت کے عقاب سے بچنے کے لئے صحیح ایمان، خالص توحید، عمل صالح اختیار کرے اور اس کی مخالف چیزیں یعنی شرک، کفر، معاصی و رذائل سے اجتناب کرنا چاہیے اور یہ چیزیں کتاب اللہ اور رسول اللہ کے طرزِ عمل میں کھول کر بیان کی گئی ہیں، انھیں سمجھنے کے لئے اور ان پر صحیح طور پر عمل پیرا ہونے کے لئے صحابہ و تابعین ائمہ اولین اور علماء سلف صالحین کی سیرت سے بخوبی مدد حاصل کی جاسکتی ہے۔

دنیا کے عقاب سے مدافعت اور بچاؤ کے لئے ضروری ہے کہ ہم خدا کے تعالیٰ کے ان قواعد و قوانین کا علم حاصل کریں جن پر نظام کائنات جاری و ساری ہے، بالخصوص معتدل مزاجی اور صحت بدنی کے قواعد، اجتماعیات کے قوانین، قواعد جس کی مثالیں واضح ہیں، مثلاً جنگ میں ناکامی اور شکست سے بچنے کا دار و مدار نظام جنگ اور فنون حرب کی واقفیت، نیز آلات و اسلحہ جنگ کی قوت و پختگی پر ہے اور یہ وہ چیزیں ہیں جو ہمارے اس زمانہ میں حیرت انگیز ترقی حاصل کر رہی ہیں۔

الغرض اس اعتبار سے آیت میں "متقین" سے مراد وہ سلیم الفطرت لوگ ہیں جن کی عقلیں صحیح راہ پر لگی ہوئی ہوں اور ان کو نورِ حق کے قبول کرنے کی اس درجہ صلاحیت رکھتے ہوں جو انھیں ان کی علمی استعداد اور ان کے نظر و اجتہاد کے مطابق خدا کی ناراضی سے بچا کر اس کی رضا جوئی پر آمادہ کرتی ہے (سورۃ ۱۲۳ تا صفحہ ۱۲۴)

ایمان بالقرآن کی حقیقت

ہر شخص جو "مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ" پر ایمان لانے کا مدعی ہو اس کے لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ قرآن سے رہنمائی حاصل کر رہا ہے۔ لوگ قرآن مجید پر ایمان لانے کی مختلف حالتیں ہیں، بیشتر قرآن پر ایمان لانے والوں سے جب ہم قرآن کے متعلق دریافت کرتے ہیں تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے۔

"قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اس میں کسی قسم کا کوئی شک و شبہ نہیں ہے"

لیکن جب ان کے اعمال و احوال کو قرآن پر پیش کیا جائے تو آپ ان دونوں چیزوں میں بڑا اختلاف و تناقض پائیں گے۔ قرآن مجید غیبت، فریب دہی، بہتان تراشی، جھوٹ، چغلخوری سے منع کرتا ہے لیکن وہ ان چیزوں میں منہمک رہتا ہے اور وہ پھر ان سے اجتناب کرنے کی کوشش نہیں کرتا، پھر آپ دیکھیں گے کہ قرآن مجید تکرار غور و فکر اور عقل و تدبر کا حکم دیتا ہے لیکن آپ دیکھیں گے کہ وہ غفلت کے کنویں میں بے خبر پڑا رہتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے تعلیمات قرآنی کو جھٹلانے والوں کی صفات میں کہا ہے "اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ" وہ آخرت کی فکر سے غافل رہتا ہے نہ اسے اپنے مستقبل کا خیال ہوتا ہے نہ قوم کے مستقبل کا۔ نہ وہ آیات رحمانیہ خداوندی میں غور و تدبر کرتا ہے نہ عبرتناک حوادث و تغیرات سے نصیحت حاصل کرتا ہے۔

آیت کریمہ میں جس مومن کا ذکر ہے اس کی صفت یہ ہے کہ وہ قرآن کا عامل اور مستقل طور پر اپنے اعمال و اخلاق کو قرآن کی بیان کردہ ہدایات و تعلیمات سے مزین و آراستہ رکھتا ہے، قرآن مجید ہی کو وہ معیار بناتا ہے اور اس پر اپنے اعمال و اخلاق پرکھتا رہتا ہے تاکہ یہ معلوم کرتا رہے کہ آیا وہ قرآن کی ہدایات کے مطابق چل رہا ہے یا ان سے دور جا پڑا ہے۔ مثال کے طور پر صلوٰۃ کو لیجئے قرآن مجید کی رو سے وہ ایک ایسا عمل ہے جو "تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ" کی تاثیر رکھتا ہے یعنی صلوٰۃ ایک ایسا عمل ہے

جو حدود اللہ کو توڑنے اور منکر و ناروا کاموں کے کرنے سے روکتا ہے۔ دوسری جگہ "مُصَلِّیْنَ" کے لئے فرمایا۔

إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ۝ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ۝ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ۝ إِلَّا الْمُصَلِّينَ (۷۰/۱۹-۲۲)

بے شک انسان پیدائشی طور پر گھبرانے والا اور جلد باز ہے۔ جب اسے شر آ لگتی پہنچتی ہے تو وہ بالکل بے دست و پا ہو کر گھبرا جاتا ہے اور جب اسے خیر و آسودگی پہنچتی ہے تو وہ اسے دوسروں سے روک لیتا ہے لیکن یہ باتیں صرف "مصلین" میں نہیں ہوتیں۔

گویا قرآن مجید "صلوٰۃ" کے متعلق یہ بتا رہا ہے کہ وہ انسان میں راسخ ہو جانے والے ان ذمائم کو بھی جو تقریباً پیدائشی اور فطری حیثیت رکھتے ہیں جڑ سے اکھاڑ پھینکتی ہے۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ اس شخص کی صلوٰۃ کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے جسے اس کی نماز نہ فحشا و منکر سے روکتی ہے نہ اس کے نفس سے بزدلی، گھبراہٹ اور جلد بازی کی جڑیں اکھاڑتی ہے نہ بخل و طمع کے جراثیم تباہ کرتی ہو ایسے شخص کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ قرآن کی زبان میں "مصلی" نہیں ہے۔ اور نہ ان نعمتوں کا مستحق ہے جن کا وعدہ اللہ نے اپنے بندوں سے کیا ہے۔ (صفحہ ۱۳۲)

کسی خبر یا حدیث کے یقینی ہونے کی کیا شکل ہے

یقین اور ایمان پر طویل بحث کرتے ہوئے کسی خبر، روایت یا حدیث کے یقینی حد تک صحیح ہونے کے متعلق تحریر کرتے ہیں:۔

"کوئی خبر (حدیث، روایت وغیرہ) اس وقت تک یقینی شکل اختیار نہیں کر سکتی جب تک اس خبر کو تم نے بذات خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سنا ہو یا پھر وہ تمہارے پاس ایسے ذرائع سے پہنچے جن میں کسی قسم کے شک و شبہ کا احتمال تک نہ ہو، اور یہ ذریعہ تواتر کے سوا اور کوئی نہیں ہے ہمارے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اس قدر طویل زمانہ گزرنے کے بعد اب "متواترات" کے علاوہ کوئی دوسرا سرچشمۂ یقین نہیں ہے۔ اور متواترات میں بھی وہ تواتر جس میں کسی ایک شخص نے بھی اختلاف نہ کیا ہو۔

لہٰذا وہ یقینی علوم جو غیبی امور مثلاً آخرت اور اس کے احوال، ملاءِ اعلیٰ اور اس کے اوصاف، صفاتِ الٰہی جو ہماری نظروں سے ماوراء ہوں، ان کے حاصل کرنے کا یقینی ذریعہ صرف ایک ہی ہے اور وہ "قرآن مجید" ہے وہی ایسی حقیقت پر مبنی کتاب ہے جو اللہ کی طرف سے ہمیں ملی ہے اور اس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہے۔ لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ ہم ان حدود پر رک جائیں جو قرآن نے اس سلسلہ میں بیان کی ہیں اور اس میں کوئی آمیزش، اضافہ یا قیاس نہ کریں۔ قرآن مجید میں آخرت پر یقین رکھنے کی سخت تاکید ہے، اس آیت میں بھی زور دینے کے لئے " وَبِالْآخِرَةِ "هُمْ" يُوقِنُونَ " کہا ہے حالانکہ اگر تاکید مقصود نہ ہوتی تو بغیر "هُمْ" کے بھی یہ بات کہی جا سکتی تھی۔ مطلب یہی ہے کہ مومنین کی ایک خاص صفت "آخرت پر یقین" ہے اور جیسا کہ ہم نے اوپر بتایا یقین اس وقت یقین کہلا سکتا ہے جب وہ بالکل قطعی حیثیت رکھتا ہو۔ اس میں کسی قسم کے شک کا احتمال نہ ہو، لہٰذا وہ افسانے جو غیب کی خبروں کے سلسلہ میں کہے گئے ہیں اور وہ احادیث جو اس موضوع پر گھڑی گئی ہیں بلکہ اہل کتاب سے منقولہ اقوال اور سلف سے منسوب باتیں، اور بعض عجیب و غریب خبریں جو متصوفین سے اس ضمن میں بیان کی گئی ہیں ان کا بھی یقین سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے"

بلکہ ان کو جاننے سے بدرجہا بہتر یہ ہے کہ آدمی ان سے جاہل و بے خبر ہی رہے۔ کیونکہ اہل قرآن کی ممتاز صفت اور مابہ الامتیاز خصوصیت "یقین" ہے اور یقین اسی وقت ہوتا ہے جبکہ قطعی دلیل ہو۔ اور ظن و گمان وہ چیزیں ہیں جنہیں قرآن تحقیر کی نظر سے دیکھتا ہے اور انھیں معیوب قرار دیتا ہے۔ لہذا قرآن کے ماننے والوں کا ان چیزوں سے کیا تعلق ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کچھ نازل کیا گیا (یعنی قرآن مجید) اس پر ایمان لانا ہی دین اسلام پر مجمل و مفصل ایمان لانا ہے۔ اس کے مطابق ایمان ایمان ہے اور اس کے مطابق اسلام اسلام ہے اس سے انکار دائرہ اسلام سے خروج ہے، اسی پر عالم اسلامی کے تعلقات مرتبط ہوتے چاہئیں اور یہی وحدت اسلامی کا ذریعہ ہے، اس کے علاوہ وہ چیزیں جو ثبوت و درجۂ علمی کے لحاظ سے اس سے کمتر حیثیت رکھتی ہیں ان کا تعلق مجتہدین کے اجتہاد سے ہے، اور اس قسم کی کسی چیز کو دینی درجہ دے کر اس سے دین میں اختلاف پیدا کرنا صحیح نہیں ہوگا۔

وہ امور جو یقینیات کے درجہ سے کمتر حیثیت رکھتے ہیں ان کا تعلق مجتہدین کے اجتہاد یا عارفین کے ذوق یا ناقلین کے اپنے اس اعتماد سے ہے جو انھیں ان لوگوں یا چیزوں پر ہے جن سے انھوں نے اسے نقل کیا۔ تاکہ وہ اپنی جانچ پڑتال، تحقیق و تمحیص کے بعد ان امور کو معتمد علیہ اعتقاد کی حیثیت دے لیں لیکن ان لوگوں کو یہ حق حاصل نہیں کہ دوسروں کو بھی اپنے عقائد کا پابند بنائیں یا وہ چیزیں جو ان کی نظر میں صحیح ثابت ہوں، دوسروں کو بھی صحیح ماننے پر مجبور کریں، اس لئے کہ جب کوئی شخص کسی سے کوئی بات نقل کرتا ہے تو اس وقت اس ناقل کی ایک خاص شعوری کیفیت ہوتی ہے جس کا احساس دوسرے کے لئے ممکن نہیں تا آنکہ وہ دوسرا شخص بھی اس نقل کرنے والے کی طرح منقول عنہ کی وہ باتیں اور حالات جان لے جس سے ناقل واقف ہے: لہذا یہ ضروری ہے کہ ناقل کو اس شخص کے حالات اخلاق اور اندرونی کیفیات کا بھی علم ہو جس سے کوئی بات نقل کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں مزید امور تشریح طلب ہیں جن سے بحث طویل ہو جائے گی۔

[یہاں علامہ رشید رضا اپنے استاذ مفتی محمد عبدہٗ کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں]

اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ بعض آحاد احادیث اس شخص کے لئے حجت ہوتی ہیں جس کے نزدیک وہ صحیح ثابت ہو جائیں اور اس کا دل ان کی صحت کی طرف سے مطمئن ہو جائے، لیکن یہ احادیث دوسروں کے لئے حجت نہیں ہوتیں نہ ان کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ بھی اس پر عمل پیرا ہوں، اور یہی وجہ ہے کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم تمام سنی ہوئی احادیث نہیں لکھا کرتے تھے، بلکہ اتباع قرآن اور عمل بالقرآن نیز علمی و صحیح و جاری سنت کے ساتھ ساتھ احادیث کا تذکرہ بھی کرتے اور سنت کے سلسلہ میں بہت کم چیزیں تحریر میں لاتے تھے جیسے حضرت علیؓ کا وہ صحیفہ تھا جس میں دیت، قیدی کی رہائی اور مکہ و مدینہ کی تحریم سے متعلق بعض احکام تھے۔ اور یہی سبب تھا کہ امام مالکؒ نے خلیفہ منصور و ہارون الرشید کی یہ پیش کش منظور نہ کی کہ وہ لوگوں کو امام موصوف کی تالیفات کا پابند کردیں۔ حتیٰ کہ موطا کی احادیث کے مطابق بھی عمل پیرا کرانے کے لئے لوگوں کو مجبور کرنا انھوں نے گوارا نہ کیا اس لئے کہ احادیث آحاد پر عمل کرنا صرف اسی کے لئے واجب ہے جو ان پر روایتاً و دلالتاً پوری طرح اعتماد رکھتا ہو۔ پھر جو شخص جس کی

روایت کو صحیح سمجھے اور اس پر اعتماد کرے وہ اس کے مطابق عمل کرے۔ اسے یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ان احادیث کو عام قانون کی شکل بنادے۔ رہ گیا عارفین کا ذوق تو اسے دین میں کوئی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ اور نہ اجماع کے تحت وہ کوئی شرعی حجت قرار پاتا ہے ہاں یہ الگ چیز ہے کہ انسان شبہات یا دو متعارض دلائل و پیش ہونے پر احتیاطاً اپنے دل سے کسی معاملہ میں استفتاً کرے اور اس پر عمل پیرا ہو جائے (صفحہ ۱۳۸)

[لیکن یہ بھی قرآن کی راہ نمائی میں کرنا چاہیئے۔]

کفر اور تکفیر

آیت "اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْہِمْ" کے ضمن میں "کفر" پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

یہاں "کفر" سے مراد ان تصریحات کا انکار ہے جو "مُنَزَّلٌ مِنَ اللہِ" کتاب میں وضاحت سے بیان کئے گئے ہیں یا سرے سے کتاب ہی کا انکار ہے، یا اس نبی کا انکار جو اس کتاب کو لے کر آیا ہے۔ الغرض کفر کا اطلاق اس وقت ہوگا جب کوئی شخص دین کے اس ضروری اور قطعی حصہ سے عناداً و تاباً و استہزاءً اعراض کرے جو منکر کو صحیح طریقہ سے ٹھیک ٹھیک پیغام نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچایا گیا ہو۔

اس سے کم کسی شکل میں کسی کی تکفیر کی کوئی خبر ہمیں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی طرف سے سننے میں نہیں آئی۔ ان کے علاوہ جتنے بھی اعمال و اقوال ایسے ہوں جو بعض دین سے منسوب امور کے خلاف ہوں اور علمی طور پر وہ اس قدر صحیح اور قطعی شکل اختیار نہ کریں جو کتاب اللہ کی سند کی طرح ہوں تو اس سے انکار کرنے والے کو کافر نہیں کہا جائے گا الایہ کہ وہ اس انکار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کا قصد کر رہا ہو، جب تک منکر کے پاس دینی سند ہو اسے کافر نہیں کہا جا سکتا خواہ اس کا شبہ کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو بشرطیکہ وہ اپنے اعتقادات پر خلوص نیت سے قائم ہو اور قطعی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ ثابت ہے اس کو حقارت سے نہ دیکھتا ہو۔

بعض متاخرین نے ظنیات میں تاویل کرنے والوں، یا بعض رد مجتہدین کے اجتہادات کی مخالفت کرنے والوں، یا بعض اخلاقی مسائل کے منکروں کو کافر کہنے کی جرأت کی ہے۔ اور اس طرح دوسرے لوگوں کو بھی تکفیر کا بازار گرم کرنے کے خطرناک اقدام کی جرأت دلائی ہے حتیٰ کہ انہوں نے کفر کا فتویٰ اتنا سستا کر دیا کہ جو ان کی بعض عادتوں کی مخالفت کرے اور وہ بھی ایسی عادتیں جو بدعت و ممنوع قسم کی حرکات ہوتی ہیں تو انہیں بھی کافر کہہ دیا جاتا ہے، حالانکہ یہ کافر بتانے والے خود کافروں کے سے عقائد، منافقوں کے سے اخلاق، رکھتے ہیں اور ان کے اعمال مشرکوں جیسے ہوتے ہیں اور اس پر بھی اپنے متعلق یہی کہتے ہیں کہ ہم سچے مومن ہیں۔ (صفحہ ۱۴)

اللہ سے مراد اللہ کا قانون یعنی سنت اللہ ہے

"خَتَمَ اللہُ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ" کی شرح کرتے ہوئے

لکھتے ہیں:۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے قانون مکافات کا بیان کیا ہے جس کا انداز یہ ہے کہ جب انسان باطل اور غلط عقائد میں پڑ جاتا ہے اور حرام کاموں میں لگا رہتا ہے اور کسی طرح حق کی طرف التفات نہیں کرتا تو اس کی یہ عمل اپنا یہ نتیجہ پیدا کرتی ہے کہ وہ معاصی کو بنظر استحسان دیکھنے کا عادی ہو جاتا ہے اور اس طرح گویا اس کے دل پر مہر لگ جاتی ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے دلوں اور کانوں پر مہر لگانے کو اپنی طرف منسوب کیا ہے اس لئے کہ یہ اس قسم کے لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔ [یعنی اس کا قانون مکافات]

دنیا میں ذلت و غلامی اور روزی کی تنگی کا باعث خدا کے احکامات کی نافرمانی ہے

وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔
یہ عذاب عظیم دنیا میں ہوگا یا آخرت میں؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے ہمیں قرآن کی متعدد آیات اپنے سامنے لانا چاہئیں۔ جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو اسلام کی ہدایت اور ذکر اللہ سے اعراض کرتا ہے اور ان امور کا لحاظ نہیں رکھتا جو اللہ تعالیٰ نے اصلاح معاش و معاد کے لئے بتائے ہیں تو اس کا بدلہ تنگی و بدحالی، دنیاوی عزت و سلطنت کا فقدان اور عقبیٰ میں عذاب عظیم ہے (ص ۱۴)

اسلامی معاشرت

(تیسرا ایڈیشن)

مسلمانوں کی روزمرّہ زندگی کیلئے قرآنی ارشادات۔ بالخصوص عورتوں، بچوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں کیلئے اس سے بہتر کتاب آپ کو نہیں ملے گی۔

قیمت دو روپے

ملنے کا پتہ:۔ ناظم ادارہ طلوع اسلام
۲۵-بی گلبرگ - لاہور

بیادِ عزّام

ضربِ کلیم

سابقہ اشاعت میں "مجلس قلندرانِ اقبال" کے تذکرہ کے ضمن میں ہم نے وعدہ کیا تھا کہ ڈاکٹر عبدالوہاب عزّام (مرحوم) کے مقدمہ ضربِ کلیم کو قارئین کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ "ضربِ کلیم" کا مطالعہ، تحقیق مطالب اور اس کی تعبیرات پر غور و فکر مجلس قلندران کی اولین نشستوں میں ختم ہوا تھا۔ اور اس کے بعد اس کا عربی زبان میں ترجمہ بھی ساتھ کے ساتھ ہوتا جاتا تھا۔ یہ عربی (منظوم) ترجمہ اپریل سنہ ۱۹۸۲ء میں حسن طبع سے آراستہ ہو کر "اقبال" فے پر شائع ہو گیا تھا۔ اس میں پہلے ڈاکٹر عزّام (مرحوم) کا لکھا ہوا مقدمہ ہے۔ اس کے بعد انہی کے قلم سے تعارف ہے۔ اور تعارف کے بعد محترم پرویز صاحب کا تحریر کردہ "پیش لفظ" ہے۔ ہم اس پورے سلسلہ کا اردو ترجمہ دوبارہ شائع کرنے کی مسرت حاصل کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

مقدمہ

(ڈاکٹر عزّام)

خدایا۔ ہم تجھ ہی سے توفیق و ہدایت کے طلبگار ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق سے شاعر فیلسوف ڈاکٹر محمد اقبال کے فارسی دیوان "پیامِ مشرق" کا عربی ترجمہ تقریباً دس ماہ میں تیار ہو گیا۔ اپریل سنہ ۱۹۵۱ء میں علامہ مرحوم کی تیرہویں برسی کے موقع پر یہ عربی دیوان کراچی میں چھپ کر شائع ہوا اور مجلس اقبال نے یوم اقبال کے سرکاری اجتماع میں اس کو پاکستان کے گورنر جنرل کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔

عربی میں اقبال کے کلام کا ترجمہ مرحوم کی دلی تمنا اور میری ایک دیرینہ آرزو کی تکمیل تھی۔ آخرکار وہ منزل آ گئی جس کی طرف میں نے بار بار قدم بڑھانے کی کوشش کی لیکن مصروفیتیں ہمیشہ سدِّراہ ہوتی رہی تھیں۔

"پیامِ مشرق" کے اس عربی ترجمہ "رسالۃ المشرق" نے پاکستان کے اہلِ علم، ادب اور سیاسی طبقہ میں غیر معمولی اثرات پیدا کئے اور

عربی خواں طبقہ میں اس کو خاص طور پر مقبولیت حاصل ہوئی۔

اس کامیابی نے مجھے اسی راہ پر گامزن رہنے کی دعوت دی کہ اس عظیم المرتبہ شاعر کے دوسرے دیوانوں کو بھی عربی میں منتقل کروں، اور اس تحریک نے مجھے اس کام کو جس کی خود میں نے ہی ابتدا کی تھی جاری رکھنے اور اس کے لئے دشواریاں برداشت کرنے پر آمادہ رکھا۔ رسالہ "الشرق" کی اس مقبولیت ہی کا نتیجہ تھا کہ بہت سے پاکستانی احباب اور متعارفین ایک دوسرے ترجمہ کی امید میں میری طرف آنکھیں لگائے ہوئے تھے۔

"پیام مشرق" کا ترجمہ کے بعد میں نے اس مقصد کے لئے "جاوید نامہ" کو تجویز کیا جس کے ترجمہ کے لئے میں نے اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ ارادہ کیا تھا۔ "جاوید نامہ" ایک ایسی داستان ہے جس میں اقبال نے مسلمانوں کے بہت سے احوال کا تذکرہ کیا ہے اور سیاحت سیارات کے پیرایہ میں اپنے فلسفہ و افکار کی تشریح کی ہے اور اس سلسلہ میں مشہور صوفی شاعر جلال الدین رومی صاحب مثنوی کو اپنا دلیل راہ بنایا ہے۔ اس لئے میں نے کسی پس و پیش کے بغیر "پیام مشرق" کے بعد "جاوید نامہ" کو ترجمہ کے لئے منتخب کر لیا۔

لیکن اقبال کو پسند کرنے والے اور اس کے شیدائیوں میں سے ایک دوست نے جو نہ صرف اقبال کے کلام اور اس کے فلسفہ و سیرت پر گہری نظر رکھتے ہیں بلکہ ان مخصوص افراد میں سے ہیں جن کو اقبال سے صحبت میسر رہی ہے، اور انھوں نے اقبال کے نظریات اور اس کے پیغام کی توضیح و تشریح میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے۔ ایک دوسرے دیوان کے ترجمہ کی تجویز میرے سامنے رکھی۔ — ہمارے دوست جناب غلام احمد پرویز نے فرمایا۔ "میری رائے ہے کہ آپ "ضرب کلیم" کا ترجمہ کریں جو اقبال کا خود مرتب کردہ آخری دیوان ہے اور "ارمغان حجاز" کے سوائے جو اقبال کی وفات کے بعد شائع ہوا ہے اس کی آخری منظومات میں سے ہے۔ اس لئے اس دیوان "ضرب کلیم" میں اقبال کا فلسفہ اور اس کے محکم افکار و نظریات پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ اور ان خاص موضوعات میں جن کو اس نے دیوان کی فصول قرار دیا ہے، اس کا پیغام نہایت واضح ہے۔ "جاوید نامہ" ایک طویل، مسلسل اور دقیق نظم ہے جس کے سمجھنے کے لئے فلسفہ و تاریخ کے کثیر سرمایہ کی ضرورت ہے اور صرف ان لوگوں کے لئے اس کے مطالب کا سمجھنا آسان ہے جن کو علم و ادب سے بہرۂ وافر میسر آیا ہو۔" "جاوید نامہ" کا مترجم ترجمہ کی تکمیل سے قبل اپنی منزل پر نہیں پہونچ سکتا۔ اس کے برعکس "ضرب کلیم" کا مترجم ہر قطعہ کا ترجمہ کر لینے کے بعد ایک نتیجہ خیز کام کی تکمیل کر لیتا ہے۔ اور اس فصل کو ختم کر کے ایک مرحلہ تک پہنچ جاتا ہے۔

ان تمام امور کے علاوہ "ضرب کلیم" میں اشعار کی تعداد کم اور ترجمہ کی سہولت نسبتاً زیادہ ہے۔ محترم دوست پیہم اسی قسم کے دلائل پیش کرتے رہے۔ یہاں تک کہ میں بھی ان کی رائے سے متفق ہو گیا کہ جاوید نامہ پر ضرب کلیم کے ترجمہ کو ترجیح دوں اور اس داستان کو ایک بار پھر کسی فرصت کے لئے اٹھا رکھوں۔ اللہ مددگار ہے۔

ہماری رائے تھی کہ ترجمہ سے پہلے اس دیوان کے مطالعہ، تحقیق مطالب اور اس کی تعبیرات میں غور و فکر کے لئے ایک جگہ مجتمع ہوتے رہیں۔ اس کے لئے طے پایا کہ اس قسم کے اجتماعات مصری سفارت خانہ کراچی کے قصر میں منعقد ہوں اور جب تک اس دیوان کے مطالعہ سے فراغت میسر آئے ہفتہ میں دو یا تین بار ہم جمع ہوتے رہیں۔

اس اندیشہ کے پیشِ نظر کہ مختلف مشغولیتیں ان مجالس میں سدِ راہ نہ ہوں ہم نے اس امر کا اہتمام کیا کہ ایک مجلس سے اس وقت تک نہ اٹھیں جب تک آئندہ نشست کے لئے کوئی وقت مقرر نہ کر لیا جائے۔ ان مجالس کا اشتیاق اور ان کی یاد ہی ان کی شرکت کے لئے زیادہ مستعد رکھتی تھی۔

میں، فاضل محترم غلام احمد پرویز اور محترم شیخ ابو احمد (انسپکٹر جنرل جنگلات حکومت پاکستان) جو فلسفۂ اقبال اور اس کی تیسیر پر لکھنے والے مصنفین میں سے ہیں اس مجلس کے ارکان تھے۔ ان کے علاوہ بہت سے اقبال دوست احباب بھی ان مجالس میں شریک ہوتے۔ بعض لوگ پابندی سے آتے اور بعض ایک دو مجلسوں میں ہی شریک ہو سکتے تھے۔ اس لئے یہ حلقہ کبھی تنگ اور کبھی وسیع ہوتا رہتا تھا۔

وقتاً فوقتاً ہم دعوتوں کا اہتمام بھی کرتے تھے۔ اور ان میں مجلس اقبال کے دوسرے ارکان اور اس کے صدر چودھری نذیر احمد کو بھی شرکت کی دعوت دیتے تھے جو اس وقت پاکستان کے وزیر صنعت تھے۔

محترم غلام احمد پرویز شیخِ مجلس تھے۔ وہ کتاب پڑھتے۔ اس کی تشریح کرتے اور فکرِ اقبال کی بحث و تفصیل میں کسی شعری و ادبی یا فلسفی موضوع کی انتہا تک پہنچ جاتے اور اس کے ساتھ ساتھ اقبال کے کلام کو قرآنی حقائق سے مربوط کرتے جاتے۔

ان مجالس کو "مجلس اقبال" یا "مجالس اقبال" کا نام دیا گیا تھا۔ ان میں شریک ہونے والے "درویشانِ اقبال" اور "قلندرانِ اقبال" کے نام سے موسوم کئے جاتے۔ اور غلام احمد پرویز صاحب "شیخ درویشاں" اور "شیخ قلندرانِ اقبال" تھے۔

عید الفطر کے بعد ۱۳۷۰ھ میں ہم نے ضربِ کلیم کا مطالعہ شروع کیا اور جب اس سے فارغ ہوئے تو میں نے کتاب کے آخری صفحہ پر بطور یادداشت حسبِ ذیل کلمات لکھے:۔

"شنبہ ۵ محرم ۱۳۷۱ھ (۱۳ اکتوبر ۱۹۵۱ء) کی شب میں دیوان کا مطالعہ تکمیل کو پہنچا۔ اول و آخر خدا ہی کے لئے حمد و ستائش ہے۔ اللہ تعالیٰ روحِ اقبال پر رحم فرمائے۔"

تین ماہ میں کتاب ختم ہو گئی۔ اگرچہ اس دوران میں بعض اوقات مشاغل کی کثرت کی وجہ سے ہم مجلس کی طرف پوری توجہ نہ دے سکے اور ان کا سلسلہ ہمارے اندازے کے مطابق جاری نہ رہ سکا۔

شب دوشنبہ ۱۱ شوال ۱۳۷۰ھ (۱۶ جولائی ۱۹۵۱ء) کو ضربِ کلیم کے ترجمہ کی ابتدا ہوئی اور جب میں اس کے ترجمے سے فارغ ہوا تو ان سطور کے نیچے جن میں مطالعہ کی تاریخ ثبت کی گئی تھی میں نے ذیل کے کلمات تحریر کئے۔

"اللہ تعالیٰ نے شب یکشنبہ ۱۸ صفر الخیر ۱۳۷۱ھ (۱۸ دسمبر ۱۹۵۱ء) کو ترجمہ کی تکمیل کی توفیق ارزانی فرمائی۔"

اس طرح تقریباً چار ماہ تک میں ترجمہ کے کام میں مشغول رہا اور مطالعہ کتاب کے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد اس سے فراغت میسر ہو گئی۔

---

* پیامِ مشرق کے ترجمہ میں طباعت کی صفائی اور دیدہ زیبی کے لحاظ سے جو فروگذاشتیں رہ گئی تھیں۔ ان کی تلافی

کی غرض سے اس دیوان کی طباعت کے لئے میں نے مصر کو ترجیح دی چنانچہ سفر وطن کی تیاری شروع کی اور جب ۲۰ دسمبر کو وطن واپس پہنچا تو سفر پیہم اور کثرت مشاغل کے دوران میں فرصت کے جو لمحات میسر آئے ان میں دیوان کی تبییض اور اس کو طباعت کے لئے تیار کرنے کا شغل جاری رکھا۔ فاضل عزیز محمود جعفر اقبالی ڈپٹی انسپکٹر حکومت مصر نے ان مبیضات کو ٹائپ کرنے کی ذمہ داری لی۔

لجنۃ الازہر نے میرے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اس دیوان کو وہ اپنے اہتمام سے شائع کریں۔ تاکہ یہ انہی کی مطبوعات میں شمار کیا جائے۔ میں نے شکر گذاری کے ساتھ ان کی یہ پیشکش قبول کر لی۔ میری خواہش تھی کہ اس کی طباعت میرے قیام مصر کے دوران مکمل ہو جائے تاکہ میں خود اس کی تصحیح کی نگرانی کر سکوں۔ اور ضرورت ہو تو بعض کلمات میں ترمیم و تبدیل کا فرض بھی انجام دوں۔ لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا اور کتاب کی طباعت سے قبل ہی مجھے پاکستان آنا پڑا۔

عزیز محترم جناب جبالی طباعت کی نگرانی اور پابندی کے ساتھ میرے پاس ہوائی ڈاک سے پروف بھیجنے کی ذمہ داری انجام دیتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔

واقعی یہ ایک خوش نصیبی ہے کہ اس عظیم فلسفی شاعر۔ اقبال۔ کی تمنا میرے ذریعہ بر آ رہی ہے۔ اور اقبال کے بعض دواوین میرے توسط سے عربی میں منتقل ہو کر قرآنی زبان کی ادبی دولت میں اضافہ کر رہے ہیں۔

یہ امر بھی میرے لئے باعث مسرت ہے کہ اسلام کے اس ممتاز شاعر کی چودھویں سالانہ یادگار کے موقعہ پر میں ضرب کلیم کو عربی لباس میں پیش کر رہا ہوں۔ جیسا کہ اس سے قبل تیرھویں برسی کے موقعہ پر میں نے "پیام مشرق" کے ترجمہ کی پیشکش کی تھی۔ بارہا میں نے یہ آرزو کی ہے کہ اقبال کے دواوین کا عربی میں ترجمہ کر دوں لیکن مجھے کبھی یہ امید نہیں تھی کہ توفیق الٰہی سے آٹھ ماہ سے کم مدت میں دو دیوانوں کے ترجمہ کی خدمت انجام دینا میرے لئے ممکن ہو سکے گا۔ اور ایک ہی سال میں ان کی اشاعت کا مرحلہ طے ہو جائے گا۔

اس توفیق عظیم کے لئے اللہ ہی کا شکر و سپاس ہے۔ اور اسی سے توفیق و الہام اور راستگاری کی التجا کی جا سکتی ہے۔ وھو حسبی ونعم الوکیل۔

عبد الوہاب عزام

۱۹ر جمادی الثانی ۱۳۷۱ھ۔ ۱۰ر مارچ ۱۹۵۲ء

تعارف

(ڈاکٹر عزام)

ضرب کلیم اقبال کا ایسا مجموعہ کلام ہے جو انسان بحیثیت فرد، انسان بحیثیت رکن جماعت، دین، تربیت، ادب، ع

سیاست کے متعلق حکیمانہ افکار و نظریات پر مشتمل ہے۔ اس اعتبار سے یہ کلام شعریت کی نسبت فلسفہ اور تفکر میں زیادہ ڈوبا ہوا ہے۔ لیکن جذبات اور تخیل کی آمیزش نے اس کو شعر کی صف میں شامل کر دیا ہے۔ کائنات کی ہر وہ حقیقت شعر بن جاتی ہے جو انسان کے جذبہ و وجدان سے آب و رنگ حاصل کر لیتی ہے یا جس کو انسانی تخیل ایک خاص شکل و صورت میں نمایاں کر دیتا ہے۔

شعریت ایک دائرہ ہے اور موضوعات شعر اس دائرہ کے خط محیط سے مرکز تک مرتب اور منظم ہیں۔ بعض موضوعات خط محیط سے قریب تر ہیں۔ ان کو شعر سے کم اور ان موضوعات سے زیادہ قریبی ربط ہوتا ہے جو اس دائرے سے خارج ہوں۔ بعض موضوعات شعریت میں زیادہ عمیق ہوتے ہیں اور اس طرح جذبہ و تخیل کے تناسب کے ساتھ یہ ترتیب مرکزی دائرہ کی خالص شعریت تک پہنچ جاتی ہے۔

ضرب کلیم میں بعض اوقات اقبال کا کلام شعر کی اس صنف میں جلوہ آرا ہوتا ہے جو مجرد حقائق سے قریب تر ہے اور بعض مرتبہ خالص شعریت میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی وہ مرکز شعر کی بہ نسبت خط محیط سے زیادہ قریب ہے۔

اس بنا پر پیام مشرق کی بہ نسبت مجھے ضرب کلیم کے ترجمے میں زیادہ مشقت اور دشواری کا سامنا ہوا ہے۔ اس دشواری کی ایک خاص وجہ میری یہ زبردست خواہش بھی تھی کہ ترجمے میں شعری نزاکتیں پوری طرح محفوظ رہیں۔ اصل کا حسن شعر پھیکا نہ ہو جائے۔ اور وہ ہلکی سی رنگین شعری نقاب نہ اتر جائے جو اقبال نے حقائق فلسفیہ کے چہرے پر ڈالی ہے۔ کہیں ایک چمن سے دوسرے چمن میں منتقل کرنے کی وجہ سے شعر کی یہ ننھی ننھی کلیاں مرجھا نہ جائیں۔

بحیثیت مجموعی یہ کلام نغمہ و موسیقی نہیں بلکہ ایک ایسی ضرب خارا شگاف ہے جو سینۂ سنگ سے چشمے پیدا کرتی ہے جیسا کہ خود اقبال نے کہا ہے۔

یہ زور دست و ضربت کاری کا ہے مقام   میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ

شاید پڑھنے والے اس کلام میں شاعرانہ انداز تخیل اور تازگی فکر کی جستجو کی بجائے ان حقیقتوں کو زیادہ شفاف محسوس کریں گے جن کو پیرایۂ شعر میں ظاہر کیا گیا ہے۔ اور شاید اس طرح وہ انشا پرداز اور مترجم کی ان دشواریوں کا بھی اندازہ لگا سکیں گے جو ایک متین اور سنجیدہ اسلوب شعر میں ان حقائق کی نقاب کشائی میں پیش آئی ہیں۔

ابواب و فصول

شاعر مشرق نے ضرب کلیم کو چھ فصلوں پر تقسیم کیا ہے۔ اور ان سے پہلے دو قطعے اور ایک قصیدہ پیش کیا ہے۔ پہلا قصیدہ ان چند ابیات پر مشتمل ہے جن میں دیوان کو نواب حمید اللہ خاں والیٔ بھوپال کے نام معنون کیا گیا ہے۔ دوسرے قطعے میں شاعر نے قارئین سے خطاب کیا ہے اور قصیدہ کو دیوان کی تمہید کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

دیوان کی فصول حسب ذیل ہیں۔

(۱) اسلام اور مسلمان۔ (یہ اس دیوان کی سب سے طویل فصل ہے)
(۲) تعلیم و تربیت
(۳) عورت
(۴) فنون لطیفہ (یہ اس دیوان کی دوسری طویل فصل ہے)
(۵) سیاست مشرق و مغرب
(۶) محراب گل افغان کے افکار

فلسفۂ اقبال اس موقعے پر اقبال کے فلسفے کے متعلق بھی چند مختصر کلمات پیش کرنا مناسب ہے جو اقبال کے مقام عالیہ اور اس کا نظریہ سمجھنے میں پڑھنے والوں کے لئے مددگار ثابت ہوں گے۔ اقبال کے فلسفے کی اساس وہ تصور ہے جس کو اس نے خودی سے تعبیر کیا ہے۔

اقبال نے بہت سے اشعار میں اپنے اس مسلک کو واضح کیا ہے اور اس کے لئے ایک جداگانہ مثنوی بھی مخصوص کی ہے جس کا نام اسرار خودی ہے۔

فلسفۂ خودی کا ماحصل یہ ہے کہ

(ا) خودی جوہر کائنات ہے۔ نظام کائنات کی بنیاد اور اس کا سر حیات ہے۔
(ب) حیات خودی مقاصد و امنگوں کی تخلیق پر مبنی ہے۔
(ج) عشق آرزو سعی پیہم، بیباک عمل اور خطر پسندی سے خودی کو فروغ میسر آتا ہے۔
(د) جہاد مسلسل اور جہد پیہم سے زندگی قوت و نمو اور فروغ پاتی ہے اور جھجک تردد، آسائش طلبی اور پستیوں پر قناعت سے شعلۂ حیات افسردہ ہو جاتا ہے۔

انسان کے لئے یہ ضروری ہے کہ خود اعتماد ہو فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور اپنے قول و فعل میں خودی کو نمایاں کرے۔ تقلید غیر پر اعتماد اور دوسروں کے سامنے دست طلب پھیلانے سے اجتناب کرے اور ان قوتوں سے غافل نہ ہو جو اس کی ذات میں ودیعت کی گئی ہیں۔

ان چیزوں سے خودی محکم ہوتی ہے اور خودی کا استحکام ہی اس زندگی کا مقصد ہے۔ شاعر مشرق اشیاء کی حسی اور معنوی قوتوں کا دلدادہ ہے۔ اور اسی لئے وہ جرمن فلسفی نیٹشے کو پسند کرتا ہے لیکن اس پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ نیٹشے صرف جسم کا ادراک کر سکا اور عرفان روح سے بے بہرہ رہا۔ اس کی دسترس محض علم و عقل تک ہے۔ قلب و عشق تک اس کو رسائی حاصل نہ ہو سکی اور اس لئے اقبال کہتا ہے کہ وہ نکتۂ توحید کا اہل نہ تھا۔

حریف نکتۂ توحید ہو سکا نہ حکیم　　نگاہ چاہیے اسرار لا الٰہ کے لئے

اقبال کے نزدیک قوت و قدرت عناصرِ جمال ہیں۔ جلال کے بغیر کمالِ جمال ناممکن ہے۔ جلال اور جمال کے عنوان سے ایک قطعہ میں وہ کہتا ہے۔

مری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی　　کہ سر بسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک
نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر　　نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتشناک

بلکہ وہ کہتا ہے کہ افسردہ و مضمحل شعلے عذاب کے لئے بھی موزوں نہیں ہیں۔

مجھے سزا کے لئے بھی نہیں قبول وہ آگ　　کہ جس کا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بیباک

اقبال کے نزدیک حسن و قبح اور خیر و شر خودی کی پستی و بلندی کے تابع ہیں۔

نمود جس کی فرازِ خودی سے ہو وہ جمیل　　جو ہو نشیب میں پیدا قبیح و نامحبوب

پختہ اور محکم خودی کی انفرادیت جماعت میں منسلک ہونے کے باوجود فنا نہیں ہوتی۔ "رموزِ بیخودی" میں اقبال نے واضح کیا ہے کہ ایک فردِ قوی کس طرح جماعت سے وابستہ ہو کر استفادہ کرتا ہے اور اس وابستگی کے باوجود اس کا انفرادی تشخص کس طرح برقرار رہتا ہے۔ ضربِ کلیم میں وہ مردِ بزرگ کے عنوان سے ایک قطعے میں کہتا ہے۔

شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق

انسان کائنات کی عظیم ترین حقیقت ہے اور کائنات کی ہر چیز اس کے تابع فرمان ہے۔ قرآن میں کہا گیا ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا ۝

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۝

وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهَارَ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَآتَاكُم مِّن كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ وَإِن تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا۔

انسان مجبور و بے اختیار نہیں بلکہ آزاد و خود مختار ہے۔ اس کا عزم نشانِ تقدیر یا آثارِ قضا پر جاری ہے۔ ایک مومن [illegible] اس دنیا میں بلکہ دنیا و آخرت میں صلاح و فساد اور بقا و فنا کا معیار ہے۔

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے　　دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

نباتات و جمادات قانونِ طبیعت کے محکوم ہیں لیکن مردِ مومن اپنے پروردگار کے احکام کی اطاعت اور فرمانبرداری کے سوا کسی چیز کا پابند نہیں ہے۔

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

تہذیبِ جدید

اقبال کہتا ہے یورپین تہذیب محض مادی ہے جس میں نہ قلب ہے نہ روح۔ اقبال نے اس تہذیب پر شدید نکتہ چینی کی ہے۔ وہ اس مادی تہذیب کے فلاسفہ کا تذکرہ کرتا ہے لیکن ان کے بیشتر نظریات کو رد کر دیتا ہے۔ وہ صرف اسلام اور اس کی تہذیب میں بشریت کی فلاح دیکھتا ہے۔ اس کے نزدیک اسلامی تہذیب ہی نوع انسانی کے باہمی ربط و ائتلاف کا ذریعہ بن سکتی ہے اور اس کو برادرانہ انس و تعاون کے ساتھ شاہراہِ حق پر مجتمع کر سکتی ہے۔

اقبال کا فلسفہ ضربِ کلیم میں

خودی اور عناصر خودی کے متعلق اقبال کا فلسفہ۔ اسلامی اور یورپی تہذیب کے متعلق اس کے نظریات اور اس کے علاوہ اس کے دوسرے حکیمانہ افکار، یہاں تک کہ ادب اور فنون لطیفہ کے متعلق اس کے زاویۂ نگاہ ضربِ کلیم کی تقریباً ہر فصل میں جھلکتے ہیں۔

اقبال کے نزدیک وہ موسیقی حرام ہے جس سے روح میں ضعف و اضمحلال پیدا ہوتا ہو۔

اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام
حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب

مصور کے لئے ضروری ہے کہ زندگی کی عکاسی کرے اور فطرت کی محاکات کرتے ہوئے آثار طبیعت میں اپنا نقش خودی نمایاں کرے۔

فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تو نے
آئینۂ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی

فقر

ضربِ کلیم اور دوسرے دیوانوں میں بہت سے مواقع پر اقبال نے فقر پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا ہے۔ وہ فقر کو کلیدِ خیر و سعادت اور سربلندی کا وسیلہ قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک فقر خطرات میں بیباکانہ کود پڑنے کا محرک ہے۔

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے
وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روحِ قرآنی

اس کا دعویٰ ہے:

خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم
عشق ہو جس کا جسور فقر ہو جس کا غیور

وہ کہتا ہے:

فقر جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے
ضرب کاری ہے اگر سینے میں ہے قلب سلیم

اس کی بڑھتی ہوئی بیباکی و بیتابی سے
تازہ ہر عہد میں ہے قصۂ فرعون و کلیم

اور اس لئے اس کی تمنا ہے کہ

اللہ کرے تجھ کو عطا فقر کی تلوار

اقبال کے کلام میں غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک فقر بے زری یا مال کی کمی کا نام نہیں ہے۔ نہ وہ احتیاج معاش اور اس متاع دنیوی کی حاجتمندی کا نام ہے جس کو انسان اپنے لئے باعث عزت سمجھتا ہے بلکہ فقر سے اس کی مراد یہ

ہے کہ نفس ہوس ملک اور حرص و طمع کی قیود سے آزاد رہ کر عمل کی طرف اس طرح پیش قدمی کرتا ہے کہ کوئی کامیابی اس میں سرکشی اور کوئی محرومی اس میں پستی پیدا نہ کرسکے۔ لہٰذا اوقات فقر سیم و زر کے انبار کا مالک بھی ہوسکتا ہے اور بہت مرتبہ صاحب سطوت بادشاہ بھی۔ لیکن مال و متاع کسی وقت بھی اس کی سطوت و جبروت کو درماندہ نہیں کرسکتے۔

فقر کا یہ مفہوم بعض صوفیا کی تشریح سے مختلف نہیں ہے۔

قشیری نے اپنے رسالہ میں یحییٰ ابن معاذ کا قول نقل کیا ہے کہ

فقر کی حقیقت یہ ہے کہ خدا کے سوا ہر چیز سے بے نیازی ہو۔

شبلی کا بیان ہے کہ

فقر کی ادنیٰ ترین علامت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تمام دنیا کا مالک ہو کر اس کو ایک ہی دن میں خرچ کر ڈالے اور پھر اس کے قلب میں یہ خطرہ گذر جائے کہ اس میں سے صرف ایک دن کی روزی روک لیتا تو اس کا فقر صادق نہیں ہے۔

رسالہ قشیریہ میں ایک دوسرے موقع پر کہا گیا ہے۔

صحت فقر کا معیار یہ ہے کہ اس ذات کے سوا جس کی طرف فقر کی احتیاج ہے کسی چیز کے حصول سے استغنا میسر آئے۔

سہروردی نے عوارف المعارف میں کتانی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ

جب فقر الی اللہ درست ہو جاتا ہے تو غنا غنی باللہ میسر آتا ہے۔ یہ دونوں احوال ہیں اور ایک کی دوسرے کے بغیر تکمیل نہیں ہوتی۔

ان بیانات سے واضح ہے کہ فقر ملک و مال کے فقدان کا نام نہیں ہے۔ اس کی حقیقت صرف یہ ہے کہ انسان ان چیزوں سے وابستہ نہ ہو جن کو وہ پا لیتا ہے یا کھو دیتا ہے۔ یعنی یہ کہ دنیا اس کے دل میں بسی ہوئی نہ ہو خواہ اس کے ہاتھوں میں کھیلتی ہو۔

اقبال کہتا ہے!

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر — جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا — اللہ کی شان بے نیازی
یہ فقر غیور جس نے پایا — بے تیغ و سناں ہے مرد غازی
مومن کی اسی میں ہے امیری — اللہ سے مانگ یہ فقیری

پیش لفظ

(مسٹر وحید صاحب)

جس کتاب کا ترجمہ آپ کے پیش نظر ہے۔ علامہ اقبال نے اس کا نام ضرب کلیم رکھا اور خود ہی اس کی تشریح ان الفاظ سے کر دی

اعلانِ جنگ۔ عصرِ حاضر کے خلاف

میرے نزدیک یہ الفاظ علامہ اقبال کی صرف ایک کتاب ضرب کلیم ہی کی شرح نہیں بلکہ ان کے پورے کے پورے پیغام کے ایک عظیم حصے کے مفسر ہیں۔ اگر حضرت علامہ کے پورے پیغام کا تجزیہ کیا جائے تو وہ دو اہم حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے ایک حصہ نعرۂ انقلاب ہے۔ اس غیر منزل من اللہ اسلام کے خلاف جسے عجمی سازش نے نہایت سادگی و پرکاری سے وضع کیا اور دوام ہم رنگ زمین کی صورت میں عین اسلام بنا کر اس امت پر مسلط کر دیا جہاں غیر قرآنی تصورات کو سمٹنے کے لئے معبوث ہوئی تھی۔ عجم کی یہ سازش درحقیقت انتقام تھی یہود و نصاریٰ و مجوس کی ان شکستوں کا جو انہیں میدانِ جنگ میں مسلمانوں کی تیغ حق کے مقابلے میں اٹھانی پڑی تھیں۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ اس امت مجاہدین کی قوت و سطوت کا راز قرآن کی حیات بخش تعلیم میں ہے۔ لہذا انہوں نے ایسی چال چل کر مسلمانوں کو قرآن سے بیگانہ بنا کر غیر قرآنی اسلام کے فریب میں الجھا دیا۔ اور یہ کچھ اس کامیاب طریق سے کیا کہ سادہ لوح مسلم اس سراب رنگ و بو کو سچ مچ کا گلستان سمجھنے لگ گیا۔ یونان کا خواب آور فلسفہ حشیشین۔ مجوس کی غلامانہ نسل پرستی۔ یہود کی قشری شریعت رسومات۔ رہبان نصاریٰ کی مرگ آور خانقاہیت ایک ایک کر کے اسلام کے لاینفک اجزا بن گئے اور اس طرح یہ ملت جو کبھی ذوق عمل سے شعلۂ جوالہ تھی کوتاہی عمل سے راکھ کا ڈھیر بن گئی۔ اقبال کے پیغام کا ایک حصہ اسی غیر منزل من اللہ اسلام کے لئے پیام مرگ اور قرآنی اسلام کے احیاء کے لئے نشید حیات تھا۔

علامہ کے پیغام کا دوسرا حصہ اس فتنے کے خلاف احتجاج مسلسل تھا جو تہذیب مغرب کے رنگ میں طوفان در طوفان امنڈے چلا آ رہا تھا اور جس کی تموج انگیز طغیانیاں ملت اسلامیہ کی زار و نزار خس و خاشاک کی طرح بہائے لئے جا رہی تھیں۔ ضرب کلیم اسی تہذیب عصر حاضر کے جنود و عساکر کے خلاف اعلانِ جنگ تھا۔

سوال یہ ہے کہ تہذیب حاضر کہتے کسے ہیں اور اقبال نے اس کی اس قدر مخالفت کیوں کی؟ اس سوال کا جواب سمجھ میں نہیں آ سکتا جب تک پہلے یہ نہ دیکھ لیا جائے کہ اسلامی تہذیب کیا ہے۔

جس شخص کے سامنے قرآن کے اوراق کھلے ہیں اس پر یہ حقیقت روشن ہے کہ اسلام ایک ضابطۂ حیات اور نظام

زندگی ہے جسے الدین کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن نے انسانی زندگی کے لئے ایک نصب العین مقرر کر دیا ہے اور اس کے ساتھ وہ حدود متعین کر دی ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے انسان اپنے اختیارات کا استعمال کر سکتا ہے نصب العین اور حدود دونوں غیر متبدل ہیں۔ انہی کو ابدی صداقتیں یا مستقل اقدار زندگی کہا جاتا ہے۔

قرآن کی رو سے اگرچہ حیات کی نمود مختلف پیکروں میں ہوتی ہے حیات کا سرچشمہ ایک ہے۔ اور یہی سرچشمہ ان ابدی صداقتوں کی اصل ہے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ سرچشمہ حیات اور ابدی صداقتوں کے سرچشمہ کی وحدت کے عقیدے سے فطری طور پر یہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ

(ا) ہر انسان من حیث الانسان زندگی کی ممکنات اپنی ذات میں مضمر رکھتا ہے جن کی نشوونما اور نمود زندگی کا مقصود ہے۔ ان جواہر مضمر کی پختگی اور تابندگی سے انسان میں شانِ انفرادیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا تحفظ بقا اور تسلسل (بعد از ممات) انسانی جدوجہد کا ماحصل ہے۔

(ب) تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں جو جغرافیائی، لسانی، نسلی اور وطنی حدود سے متاثر نہیں ہوتی۔

(ج) تمام نوعِ انسانی کی فلاح کا راز ایک ہی ضابطۂ زندگی کے مطابق زندگی بسر کرنے میں ہے جو وحی کے ذریعے مل سکتا ہے۔ اور جو آج اس آسمان کے نیچے، قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے۔

ان محکم اصولوں کی بنیاد پر اسلام ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں نوعِ انسانی زندگی کے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی شرفِ انسانیت کے سدرۃ المنتہیٰ تک جا پہنچے۔ اس معاشرے کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں۔

(۱) ان میں افرادِ معاشرہ اپنے اندر ان صفاتِ خداوندی کو منعکس کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں جنہیں قرآن اسماء الحسنیٰ سے تعبیر کرتا ہے اور جو کائنات میں مستقل اقدار کا سرچشمہ ہیں۔

(۲) ان افراد میں ایسا ضبط پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ ان صفات میں ٹھیک ٹھیک توازن قائم رکھ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اسماء کے لئے حسنیٰ کی شرط ضروری ہے اور حسن نام ہے تناسب کے اعتدال کا۔

(۳) ان افراد کی نگاہوں میں ایسی بصیرت پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ صحیح صحیح فیصلہ کر سکتے ہیں کہ فلاں خارجی حادثہ کی صورت میں فلاں قسم کی صفتِ خداوندی کا ظہور ہونا چاہیئے۔

(۴) ان افراد پر مشتمل جماعت میں اشیائے فطرت کی تسخیر کی قوت اور ان کے ماحصل کو فلاح انسانیت کے لئے صرف کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

(۵) وحدتِ خالق، وحدتِ انسانیت اور وحدتِ داستانِ ملت کے تصورِ محکم سے انسان اور کائنات۔ انسان اور انسان۔ اور خود انسان کے اپنی ذات کے تضادات میں توافق پیدا ہو جاتا ہے جس سے انسانی معاشرہ کی ناہمواریاں مٹتی چلی جاتی ہیں۔

(۲) اس جماعت کا ہر فرد اپنے آپ کو خدا کی صفت رب العالمین کا مظہر سمجھتے ہوئے بلا مزد و معاوضہ انسانیت کی ربوبیت کا کفیل بن جاتا ہے۔ اس طرح تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بھی از خود پوری ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اور ان کی فطری صلاحیتوں کے کامل نشوونما کے وسائل و اسباب یکساں طور پر میسر ہوتے جاتے ہیں۔ اور اس طرح زندگی کی جوئے رواں، ہنستی، کھیلتی، رقص کرتی، شاداں و فرحاں اقطار السموٰت والارض سے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

یہ ہے مختصر الفاظ میں قرآنی تہذیب کا ماحصل۔ اس کے برعکس تہذیب عصر حاضر اس تصور کی یکسر نقیض ہے۔ اس تہذیب کی اساس یہ فلسفہ ہے کہ مادی عناصر کے محض اتفاقیہ طور پر یکجا ہو جانے سے حیات وجود میں آگئی۔ اور ان عناصر کے منتشر ہو جانے سے اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ دنیا یہی مادی عناصر کی دنیا ہے جس میں ہر شے تغیر پذیر ہے۔ لہذا دنیا میں نہ کوئی مستقل اقدار ہیں، نہ قانون مکافاتِ عمل۔ خیر وہ ہے جس سے کسی فرد یا افراد کے گروہ، قوم کو ذاتی فائدہ حاصل ہو جائے (خواہ اس سے دوسرے افراد یا دوسری قوم کی رگ حیات ہی کیوں نہ کٹ جائے) اور شر وہ ہے جس سے کسی فرد یا قوم کا ذاتی نقصان ہو۔ ہر فرد یا قوم کا نصب العین حیات منفعت خویش کا حصول ہے اور علم و عقل کا کام یہ ہے کہ وہ اس منفعت کے حصول کے لئے اسباب و تدابیر اور حیل و مکائد فراہم کرے۔ اس فلسفۂ حیات (یا تہذیب عصر حاضر) کا نتیجہ یہ ہے کہ انفرادی طور پر خود اہل مغرب کی تحقیق کے مطابق، وہاں کی آبادی کا ہر چھٹا فرد ایسا ہے جسے عمر کا کچھ نہ کچھ حصہ پاگل خانے میں گذارنا ہوگا۔ اور اجتماعی طور پر یہ عالم ہے کہ دنیا کی مختلف قومیں یا تو باہمی کشت و خون کے لئے مصروف پیکار رہتی ہیں یا اس کشت و خون کی تیاری میں مشغول۔

اقبال نے اقوام مغرب کے فلسفۂ حیات اور نظریۂ سیاست و عمرانیت کا گہری نظروں سے مطالعہ کیا۔ جس سے اس پر یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ یہ فلسفۂ حیات اور منہاج زندگی دنیا میں جہنم پیدا کر دینے کا موجب ہے۔ دوسری طرف قرآنی بصیرت نے اس پر حقائق زندگی کو اس طرح واشگاف کر دیا کہ وہ بادلوں میں چھپی ہوئی بجلیوں اور ہواؤں میں مستور طوفانوں کو بے حجاب اپنے سامنے دیکھ لیتا تھا۔ یہی تھی وہ قرآنی بصیرت جس کی بنا پر اس نے ۱۹۰۷ء میں قوم مغرب کو للکار کر کہہ دیا تھا کہ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

اس وقت سے لے کر اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اقبال اقوام مغرب کو بالعموم اور ملت اسلامیہ کو بالخصوص اس ابلیسی تہذیب کے نتائج و عواقب سے آگاہ کرتا رہا۔ اس مجموعۂ انذار و تنذیر کا نام ہے ضرب کلیم جس سے اقبال بتکدۂ عصر حاضر کے تمام بتوں کو پاش پاش کر کے رکھ دیتا ہے۔ لیکن وہ اپنے عصائے کلیمی سے صرف فرعونیت۔ ہامانیت اور قارونیت

ہی کے نگاہ فریب سحر کو نہیں توڑتا بلکہ وہ اس کے بعد اپنی قوم کو تنزیل قرآنی کی روشنی میں فاران وسینا کی ان محفوظ دبابرکت وادیوں میں لے جاتا ہے۔ جہاں زمین سے فوز و فلاح کے چشمے ابلتے ہیں اور آسمان سے رشد وسعادت کے من وسلویٰ اترتے ہیں

پیام اقبال کی خوش بختی ہے کہ وہ رفیق محترم صاحب السعادۃ عبدالوہاب عزام بے کی "خارا شگافی اور جوئے شیر آوری" کے تصدق، تنگنائے اردو سے نکل کر بحیرۂ عرب میں بادباں کشا ہوتا ہے، اور اس طرح اپنی اس فادیت کو جو اس وقت تک شرمندۂ ساحل تھی، بیکراں بنا رہا ہے۔

اور خوش بختی ہے خود عربی بولنے والی ملتِ اسلامیہ کی جو اس پیام حیات بخش سے، جو معنوی لحاظ سے ان سے اس قدر قریب ہونے کے باوجود لفظی اعتبار سے ان سے اتنا دور تھا، شرف تعارف حاصل کر رہی ہے۔

جمع القرآن

شیخ عطاء اللہ (گجراتی) مرحوم کی بصیرت افروز تالیف جس میں انھوں نے خود قرآن کریم سے یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن نبی اکرمؐ کی زندگی میں موجودہ شکل میں جمع اور مرتب ہو چکا تھا۔ اور آج تک اسی طرح محفوظ چلا آ رہا ہے۔

پہلے یہ کتاب

طلوع اسلام میں دو قسطوں میں شائع ہوئی تھی۔ اب اسے الگ کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے۔

ضخامت اسّی صفحات (طلوع اسلام کا سائز) ٹائیٹل کور کے ساتھ

قیمت فی جلد۔ ایک روپیہ

جلد منگا لیجئے۔ کیونکہ کتاب محدود تعداد میں طبع ہوئی ہے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵۔ بی۔ گلبرگ۔ لاہور

اسلام کی سرگزشت

فصل سوم

تشریع

عرب کا قبائلی نظام

زمانۂ جاہلیت میں حجاز کے عرب ـــ جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں ـــ بادیہ نشین یا بادیہ نشینوں کی طرح تھے۔ ان کی کوئی منظم حکومت نہیں تھی۔ نہ ان کے ہاں ایسے بادشاہ تھے جو اپنی تنفیذی قوت سے لوگوں کو ایک دوسرے پر زیادتی کرنے سے باز رکھتے۔ ان کے ہاں قبیلے ہوتے تھے۔ جب ان کی تعداد بڑھ جاتی تو وہ بطون، افخاذ اور عشائر میں تقسیم ہو جاتے تھے۔ قبائل کے افراد کے درمیان جو رشتہ ہوتا تھا، وہ خون کا رشتہ تھا۔ وہ تمام لوگ جو ایک خون سے ہوتے ـــ خواہ یہ چیز محض ان کے خیال ہی میں ہوتی ـــ ایک وحدت شمار ہوتے تھے۔ افرادِ قبیلہ کو قبیلہ کی حمایت سے فائدہ اٹھانے اور اپنی مدد کے لئے اسے پکارنے کا حق ہوتا تھا۔ پورے قبیلہ کی ذمہ داری تھی کہ وہ ہر فرد کی طرف سے مدافعت کرتا اور اس کے خون کا مطالبہ کرتا۔ ہر فردِ قبیلہ کا فرض تھا کہ وہ قبیلہ کی مدافعت کرے اور اس کے عرف اور رواج کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے۔ ہر قبیلہ کا ایک سردار ہوتا تھا جس کی سیادت تمام افرادِ قبیلہ پر قائم ہوتی تھی۔ اسے یہ سیادت یا تو اس وجہ سے ملتی تھی کہ وہ انہیں گھرانے میں پیدا ہوا ہے یا اس وجہ سے کہ اس کی عمر سب سے زیادہ ہے یا اس وجہ سے کہ وہ صاحبِ حکمت اور صاحبِ عقل ہے۔ دوسرے قبائل سے خارجی تعلقات کی تعیین و تشکیل اس سردار کے ہی ہاتھوں سرانجام پاتی تھی۔ یہ اپنا اثر و نفوذ اور قوت و طاقت قبیلہ کی رائے عامہ سے حاصل کرتا تھا، فوج یا لشکر وغیرہ کے ذریعے نہیں۔

ان کے قاضی اور حکام

ہر قبیلہ کے اپنے عرف اور رسوم و رواج ہوتے تھے۔ جن میں سے کچھ تو بعض اوقات مشترک ہوتے تھے، اور کچھ الگ الگ۔ یہ باہمی فرق اور اختلاف بادیہ نشینی سے قرب اور بُعد کی وجہ سے ہوا کرتا تھا۔ ہر قبیلہ کا ایک حَکَم یا فیصلہ کن شخص ہوتا تھا جو افرادِ قبیلہ کے باہم تنازعات کا فیصلہ اپنے رسوم و رواج اور تجربات کے مطابق کیا کرتا تھا۔ چنانچہ اغانی میں اکثم بن صیفی کے متعلق ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں عرب کے قاضی تھے۔ میدانی نے عامر بن الظرب کے متعلق لکھا ہے کہ وہ

مرجع بنے ہوئے تھے۔ عرب کے لوگ ان کی سمجھ کے مقابلہ میں کسی کی سمجھ کو اور ان کے فیصلہ کے مقابلہ میں کسی کے فیصلہ کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔ کتب ادب میں تلاش کرنے سے یہی نظر آتا ہے کہ عرب کے لوگ کبھی تو فیصلہ کے لئے قبیلہ کے سردار کے پاس جاتے تھے کبھی کاہن کے پاس، اور کبھی ایسے شخص کے پاس جو عمر کی زیادتی اور اصابتِ رائے میں ان کے ہاں مشہور ہوتا تھا۔ ان میں سے ہر ایک خصوصیت کے ساتھ کس کس قسم کے معاملات میں فیصلے دیتا تھا؟ اس کے لئے فاصل حدود مقرر کرنا نہایت ہی دشوار ہے بلکہ ہمیں تو اس میں بھی پورا پورا شک ہے کہ درحقیقت ایسی کوئی فاصل حدود تعیین بھی پا سکیں۔

یہ حکام کسی مدوّن قانون یا مشہور قواعد وضوابط کے مطابق فیصلے نہیں کرتے تھے بلکہ وہ فیصلوں میں اپنے عرف اور رسوم و رواج کی طرف رجوع کرتے تھے۔ جو کبھی تو تجربات پر مبنی ہوتے تھے اور کبھی اپنے اعتقادات پر۔ اور بعض اوقات وہ ان احکام پر مبنی ہوتے تھے جو یہود دیت کے راستے سے ان تک پہونچ گئے تھے۔ اس جاہلی قانون کا جو عرف اور رسم و رواج پر مبنی ہوتا تھا کوئی معاوضہ مقرر نہیں تھا۔ فریقین اس پر بھی مجبور نہیں تھے کہ وہ فیصلہ کے لئے ضرور کسی کے پاس جائیں اور اس کے فیصلہ کو مانیں۔ اگر وہ فیصلے کے لئے کسی کے پاس چلے جائیں تو فبہا ورنہ کوئی بات نہیں تھی۔ اگر فیصلہ صادر ہو جائے تو فریقین کا جی چاہے تو اسے تسلیم کر لیں۔ نہ جی چاہے نہ تسلیم کریں۔ فیصلہ تسلیم نہ کرنے کی صورت میں بجز اس کے کہ قبیلہ کی ناراضگی برداشت کرنی پڑتی تھی اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔

ادبی کتابوں نے باہمی جھگڑوں میں ان کے بہت سے فیصلے نقل کئے ہیں۔ مثلاً دو سردار اس امر میں جھگڑتے ہیں کہ کون بڑا سردار ہے۔ دونوں فیصلہ کے لئے کسی ثالث یا حکم کے پاس جاتے ہیں۔ جس کے حق میں وہ فیصلہ کر دیتا، فضیلت و شرف اسے اور اس کے خاندان کو حاصل ہو جاتا اور ذلت و خواری اسے جس کے خلاف فیصلہ صادر ہوتا۔ یہ قصے بتلاتے ہیں کہ یہ حکام اسی قبیل کے ہوتے تھے جنہیں ہم آجکل کی اصطلاح میں حکم یا ثالث کہتے ہیں۔ ان کا کوئی تسلط اور غلبہ نہیں ہوتا تھا جو حکومت سے ان کو ملا ہو۔ کیونکہ حکومت تو ان کے ہاں تھی ہی نہیں۔ نہ کوئی ان کے ہاں بادشاہ تھا۔ فریقین اس کے لئے مجبور نہیں تھے کہ وہ حاکم کے سامنے فیصلہ کے لئے جائیں زیادہ سے زیادہ یہ تھا کہ ایک آدمی ان پر حجت رہتا۔ عمر کی فیصلہ اور ان کے وقائع اور انساب کے متعلق وسعتِ علم میں مشہور ہو جاتا تھا اور وہ اسے اپنا حکم اور ثالث مقرر کر لیتے تھے۔ امام بخاری نے اسلام سے ذرا پہلے کا ایک خونیں قضیہ نقل کیا ہے[1]۔ واقعہ یہ ہے کہ بنو ہاشم کے ایک آدمی کو قریش کے (کسی دوسرے خاندان کے) ایک آدمی نے مزدوری پر رکھا اور اسے لے کر اپنے اونٹوں میں چلا گیا۔ اتفاقاً بنو ہاشم کے کسی آدمی کا ادھر سے گذر ہوا — جس کی خورجین کی رسی ٹوٹ گئی تھی — اس نے اس ہاشمی سے کہا کہ میری مدد کرو۔ ایک رسی مجھے دیدو جس سے میں اپنی خورجین کا منہ باندھ دوں تاکہ اونٹ بدک نہ جائے۔ اس ہاشمی ملازم نے اس دوسرے ہاشمی کو ایک رسی دیدی اور اس نے اپنی خورجین کا منہ اس سے باندھ دیا اور وہ چلا گیا۔ جب منزل پر یہ لوگ اترے تو اس ہاشمی ملازم نے تمام اونٹ تو باندھ دیئے مگر ایک اونٹ بندھنے سے رہ گیا۔ مالک نے پوچھا کہ یہ اونٹ کیوں نہیں باندھا؟ ملازم نے بتایا کہ اس

---

[1] بخاری نے اسے باب القسامۃ میں بیان کیا ہے۔

کی رسّی نہیں ہے۔ مالک نے کہا کہ آخر اس کی رسّی کہاں گئی؟ اور لکڑی اٹھا کر اسے پیٹنا شروع کر دیا جس سے وہ مرنے کے قریب ہو گیا۔ ابھی وہ زندہ ہی تھا کہ یمن کے ایک آدمی کا وہاں سے گذر ہوا...... اس ہاشمی ملازم نے اس سے کہا کہ کیا جب کبھی ممکن ہو سکے وہ اس کا ایک پیغام پہنچا دے گا؟ یمنی نے وعدہ کر لیا۔ ہاشمی ملازم نے کہا کہ جب کبھی حج کے لئے تیرا جانا ہو تو مکہ میں پہنچ کر پہلے قریش کو پکارنا جب سارے قریش جمع ہو جائیں تو پھر بنو ہاشم کو پکارنا۔ جب سارے بنو ہاشم جمع ہو جائیں تو پوچھنا کہ ان میں ابوطالب کون ہیں اور ابوطالب کو بتا دینا کہ مجھے فلاں شخص نے ایک رسّی کی گمشدگی کی وجہ سے قتل کر دیا ہے۔ یہ کہہ کر وہ ہاشمی ملازم مر گیا۔ جب اونٹوں کا مالک مکہ میں آیا تو ابوطالب اس کے پاس پہنچے اور پوچھا کہ ہمارے خاندان کا وہ ہاشمی جوان کہاں گیا جسے تم ملازم بنا کر لے گئے تھے۔ اس نے کہہ دیا کہ وہ بیمار ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی بڑی خدمت کی مگر وہ جانبر نہ ہو سکا۔ بالآخر وہ مر گیا اور میں نے اسے دفن کر دیا۔ ابوطالب مطمئن ہو گئے اور کہنے لگے کہ تم سے اسی کی توقع تھی۔ زمانہ یونہی گزرتا گیا تا آنکہ وہ یمنی شخص جسے اس ہاشمی ملازم نے وصیت کی تھی حج کے لئے آیا اور پوچھتا پوچھتا سیدھا ابوطالب کے پاس پہنچا اور بتایا کہ مجھے فلاں آدمی نے ایک پیغام تم تک پہنچانے کے لئے دیا تھا اور وہ پیغام یہ تھا کہ اسے فلاں آدمی نے ایک رسّی کی گمشدگی کی وجہ سے قتل کر دیا ہے۔ ابوطالب یہ سنتے ہی اونٹ والے کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ ہم تمہیں تین باتوں کا اختیار دیتے ہیں۔ ان میں سے جونسی بات چاہو منظور کر لو۔ تم چاہو تو ایک سو اونٹ خون بہا کا ادا کر دو کیونکہ تم نے ہمارے آدمی کو قتل کیا ہے۔ اگر تم اسے نہیں مانتے تو تمہارے خاندان کے پچاس آدمی حلف اٹھائیں کہ تم نے اسے قتل نہیں کیا ہے۔ اگر یہ دونوں باتیں منظور نہ ہوں تو پھر ہم تمہیں اس آدمی کے بدلے میں قتل کر دیں گے...... الخ الحدیث۔

مکہ کا عدالتی نظام

اس قصّے سے عربوں کے عدالتی نظام کی بہت سی اقسام پر روشنی پڑتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مکہ اسلام سے پہلے اپنے نظامِ حکومت میں کافی ترقی کر چکا تھا جس کا ایک شعبہ قضا بھی تھا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ مکہ میں دس خاندانوں پر دس خدمات بٹی ہوئی تھیں[1] مثلاً دربانی کعبہ۔ سقایہ۔ مہمان نوازی۔ شوریٰ اور علم برداری۔ ان خدمات میں سے ایک خدمت ایسی بھی تھی جو قضا سے تعلق رکھتی تھی اور زمانہ جاہلیت میں وہ ابوبکرؓ کے حوالے تھی۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ ابوبکرؓ کے ذمہ مالیاتی چیزیں تھیں یعنی خون بہا اور تاوان وغیرہ۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ بعض قبائل قریش نے متفقہ طور پر حلف الفضول کا معاہدہ کیا تھا اور انہوں نے حلف اٹھائے تھے کہ مکہ میں وہ کسی اجنبی مسافر اور اپنے واقف و رشتہ دار پر کسی طرح کا ظلم نہیں ہونے دیں گے۔ کسی آزاد یا غلام پر اگر ظلم ہوا تو وہ اس وقت تک اس کا ساتھ دیں گے جب تک اس کا حق اسے نہ دلوا دیں۔ اگر اس پر کوئی زیادتی ہوئی ہو گی تو وہ اپنے پاس سے اس کو ادا کریں گے یا دوسروں سے دلوائیں گے۔

مدینہ کا عدالتی نظام

مدینہ منورہ میں اسلام سے پہلے تشریع اور قانون سازی بہ نسبت دوسری جگہوں کے کسی قدر ترقی یافتہ صورت میں پائی جاتی تھی کیونکہ یہاں کے عرب یہودیوں کے ساتھ کافی اختلاط رکھتے تھے

---

[1] یہ تفصیل عقد فرید میں ملاحظہ ہو۔

اور یہودیوں کے پاس تورات اور اس کی شرحیں موجود تھیں جن میں احکام اور قوانین پائے جاتے تھے۔ اور مدینے کے لوگ عام حالات میں یہودی قانون کی پیروی کیا کرتے تھے۔

اسلام اور زمانۂ جاہلیت کے قوانین

اسلام نے زمانۂ جاہلیت کے قانون، بالفاظ دیگر عربوں کے عرف عام اور ان کے رسم و رواج کے ساتھ بالکل بے تعلقی نہیں برتی۔ ان میں سے بعض باتوں کو برقرار رہنے دیا۔ بعض باتوں کو ختم کر دیا۔ اور بعض باتوں کو معتدل بنا دیا۔ مثلاً جن چیزوں کو باقی رکھا ان میں سے ایک قسامت تھی جس کا قصہ ہم بخاری کے حوالے سے پہلے بیان کر چکے ہیں چنانچہ مسلم اور نسائی نے حضور اکرم صلعم کے کسی صحابیؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے قسامت کو اسی انداز پر باقی رہنے دیا تھا جس انداز پر وہ زمانۂ جاہلیت میں تھی۔ اور اس کے مطابق ایک مقتول کے بارے میں انصار کے کچھ لوگوں کے درمیان فیصلہ کیا تھا جس کے قتل کا دعویٰ انہوں نے خیبر کے یہودیوں کے خلاف کیا تھا۔[1] جاہلیت کی شریعت کے بعض احکام کو جو حج، نکاح، طلاق، پھر خلع اور ایلاء وغیرہ سے تعلق رکھتے تھے تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ معتدل بنا لیا تھا۔ گود لے لینا اور کسی کے بیٹے کو اپنا بیٹا بنا لینا جو عربوں پر عام طور پر رائج تھا۔ اسلام نے اسے قطعاً لغو قرار دیا جیسا کہ بعض خرید و فروخت کی صورتوں میں پتھر پھینک کر، ہاتھ سے چھو کر، کنکری مار کر وغیرہ وغیرہ کو اسلام نے لغو قرار دے دیا تھا۔ اگر ہم تفصیل سے زمانۂ جاہلیت کے اس نظام کو بیان کریں اور پھر یہ بتائیں کہ اسلام نے ان میں سے کن چیزوں کو معتدل بنا کر اختیار کر لیا تھا اور کن کن چیزوں کو لغو قرار دے دیا تھا تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔

رسول اللہ صلعم تشریف لائے اور مکہ میں تیرہ سال اور مدینہ میں دس سال آپ نے قیام فرمایا۔ یہ زمانہ یعنی ہجرت کے بعد آپ کی حیات طیبہ کا یہ عہد ہی درحقیقت تشریع اور قانون سازی کا عہد تھا۔ اس عہد میں قرآن کریم بھی احکام و قوانین لے کر نازل ہو رہا تھا۔ اور رسول اللہ صلعم خود بھی پیش آمدہ حوادث و وقائع میں اپنی احادیث سے قوانین و احکام بنا رہے تھے۔ یہ دونوں سرچشمے — کتاب اور سنت — اسلامی تشریع اور قانون سازی کے عظیم ترین سرچشمے تھے۔

قرآن

قرآن کا نزول — جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں — آہستہ آہستہ تئیس ۲۳ سال کی مدت میں ہوا تھا۔ اس میں سے کچھ مکہ مکرمہ میں نازل ہوا تھا جو قرآن کے دو تہائی حصہ کے قریب تھا اور کچھ مدینہ منورہ میں نازل ہوا جو قرآن کے ایک تہائی حصہ کے لگ بھگ تھا۔

ہم مکی آیتوں کی جستجو کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں مسائل مدنیہ، احوال شخصیہ اور تعزیرات وغیرہ سے متعلق قانون سازی کے کام کو بالکل نہیں چھیڑا گیا۔ محض دین کے اصول اور ان اصولوں کی طرف دعوت پر اکتفا کیا گیا جیسے مثلاً اللہ، اس کے رسول، یوم آخر پر ایمان، مکارم اخلاق مثلاً عدل، احسان، وفا، عہد، عفو و درگزر، محض خلوص سے ڈرنا، شکر کرنا وغیرہ کا حکم دیا گیا تھا اور خصائل و عادات مثلاً زنا، قتل، لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے، ناپ تول میں کمی کرنے وغیرہ سے دور رہنے کی تاکید کی گئی تھی۔ اور ہر اس

---

[1] تیسیر الوصول صفحہ ۲۱ ج ۳

چیز سے روکا گیا تھا جو کفر تھی یا کفر کے تابع ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ جو عبادات مکہ میں مقرر ہو چکی تھیں مثلاً نماز اور زکوٰۃ وغیرہ وہ بھی اس وضاحت اور تفصیل کے ساتھ مقرر نہیں کی گئی تھیں جو آگے چل کر مدینہ میں ہوئیں، چنانچہ مکہ میں جو زکوٰۃ تھی وہ صدقہ دینے اور اچھی راہوں میں مال خرچ کرنے کے معنی میں تھی۔ اس کے لئے نہ کوئی خاص نصاب مقرر کیا گیا تھا اور نہ ہی اس کا کوئی خاص نظام تھا۔ یہی حال نماز کا تھا۔ ابتداءً مسلمانوں کو ایک طرح پر نماز کا حکم دیدیا گیا تھا جس میں اس کی کوئی حد بندی نہیں کی گئی تھی کہ وہ دن رات میں پانچ مرتبہ ہوگی یا کم و بیش۔ غالباً اس کی واضح ترین مثال (کہ وہ تعلیمات کیا تھیں جن کی طرف اسلام مکہ میں دعوت دیتا تھا) سورۂ الانعام ہے جو مکی ہے۔

امور مدنیہ مثلاً بیع، اجارہ، سود وغیرہ اور تعزیراتی امور مثلاً قتل، چوری وغیرہ اور احوال شخصیہ مثلاً نکاح اور طلاق وغیرہ کے متعلق قانون سازی ساری کی ساری رسول اللہ صلعم کے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمانے کے بعد ہوئی۔ غالباً اس نوع کی قانون سازی کا واضح ترین نمونہ سورۂ بقرہ اور سورۂ نساء ہیں جو دونوں مدنی ہیں۔ اس کا سبب واضح ہے کہ اصول دین جن کو قرآن نے مکہ میں پیش کیا۔ منطقی طور پر ان اصولی احکام پر اہمیت میں مقدم تھے جنہیں بعد میں مدنی تشریع نے پیش کیا۔ نیز قانونی احکام حکومتی قوانین سے مشابہت رکھتے تھے جو ظاہر ہے کہ حکومت بن جانے اور حکومت مستحکم ہو جانے کے بعد ہی بنا کرتے ہیں۔ یہ صورت آگے چل کر مدینہ ہی میں ہوئی۔ مکہ مکرمہ میں تو نبی صلعم کا سارا زمانہ لوگوں کو نئے دین کی طرف دعوت دینے ہی میں گذر گیا اور ابتدائی سالوں میں بجز چند تھوڑے سے آدمیوں کے اس دین میں کوئی داخل نہیں ہوا۔

قانونی آیات

یہ قانونی آیات جنہیں ہمارے فقہا آیاتِ احکام کہتے ہیں قرآن کریم میں زیادہ نہیں ہیں۔ قرآن کریم میں تقریباً چھ ہزار آیتیں ہیں اور وہ آیتیں جن کا تعلق قوانین اور احکام سے ہے دو سو سے زیادہ نہیں ہیں حتیٰ کہ بعض وہ آیتیں جنہیں فقہاء نے آیات احکام میں شمار کر لیا ہے بظاہر احکام اور قوانین کی آیات معلوم نہیں ہوتیں۔ بلا شبہ انہیں آیات احکام میں شمار کر لینا استنباط میں مبالغہ اور غلو ہی کا نتیجہ ہے۔ آیات کا سیاق اس کی تائید نہیں کرتا۔ مثلاً قرآن کریم کی اس آیت إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللَّهِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً (اے پیغمبر اسلام! جب منافقین تمہارے پاس آئیں اور کہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ بلاشبہ تم ضرور اللہ کے رسول ہو۔ اور اللہ جانتا ہے کہ تم یقیناً اس کے رسول ہو مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافقین اپنی اس شہادت میں جھوٹے ہیں۔ انہوں نے اپنی قسموں کو اپنی ڈھال بنا رکھا ہے) سے یہ استنباط کرنا اور یہ نتیجہ نکالنا کہ نَشْهَدُ کا لفظ قسم اور حلف کے الفاظ میں سے ہے مبالغہ و غلو نہیں تو اور کیا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم کی اس آیت وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ (اور خدا نے گھوڑوں، خچروں اور گدھوں کو اس لئے پیدا کیا کہ تم ان پر سواری کرو اور وہ تمہارے لئے باعث زینت ہوں اور خدا ان کے علاوہ بہت کچھ پیدا کرتا رہتا ہے جو تم جانتے بھی نہیں ہو) سے اس نتیجہ تک پہنچنا کہ گھوڑے، خچر اور گدھے کا گوشت حرام ہے مبالغہ آرائی ہی کی ایک

مثال ہے یا قرآن کریم کی اس آیت اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ سے یہ استدلال کرنا کہ قربانی کرنا واجب ہے غلطی کی ایک مثال ہو سکتی ہے۔ بہرحال اس قسم کی بہت سی مثالیں ہیں کہ اگرچہ آیات کا سیاق تائید نہیں کرتا مگر فقہا نے ان کو آیاتِ احکام میں شمار کیا ہے۔

قرآن کی ترتیب توقیفی ہے

قرآن کی ترتیب توقیفی ہے (وحی کے مطابق قائم کی گئی ہے)، اس میں تاریخ نزول کی رعایت ملحوظ نہیں رکھی گئی اور نہ ہی اتحادِ موضوع کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس لئے آپ کو قانونی آیات کسی ایک جگہ جمع کی ہوئی نہیں ملیں گی اور نہ ہی ایک موضوع سے متعلق آیات ایک مقام یا دو مقاموں پر ملیں گی شاذ و نادر ہی ایک موضوع سے متعلق آیات کسی ایک جگہ مل سکتی ہیں جیسے مثلاً میراث سے متعلق یا طلاق سے متعلق آیات۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کا مقصدِ اولیٰ، ارکانِ دین کی تاسیس، توحید کی طرف دعوت، تہذیبِ اخلاق اور مبادی اخلاق کا قیام ہے تشریعی مقصد ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر وہ آیات بھی جو قانونی حیثیت رکھتی ہیں، اولیٰ مقصد کے ماتحت دعوت و ہدایت کے اسلوب کے مطابق ہی وارد ہوئی ہیں، قانون کے مقررہ اسلوب کے مطابق نہیں۔ مثلاً یہ آیت دیکھئے۔

يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ٥ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَن يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَن ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَوٰةِ فَهَلْ أَنتُم مُّنتَهُونَ ٥ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَاحْذَرُوا فَإِن تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوٓا أَنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ٥

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! بات یہی ہے کہ شراب، جوا، بتوں کے استھانوں پر چڑھاوے اور پانسے کے ذریعے معاملات کے فیصلے، سب گندی چیزیں اور شیطانی کام ہیں۔ ان سے بچو۔ توقع ہے کہ اس طرح تمہاری کھیتیاں پروان چڑھ جائیں گی۔ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے میں تمہارے درمیان عداوت اور بغض کا بیج بوئے اور تمہیں خدا کے قانون کو نگاہ کے سامنے رکھنے سے اور الصلوٰۃ سے باز رکھے۔ اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! کیا تم ان شیطانی کاموں سے باز آجانے والے ہو؟ اللہ کی فرمانبرداری اختیار کرو اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور بری باتوں سے بچتے رہو۔ اگر تم پھر ان باتوں کی طرف لوٹ جاؤ تو یاد رکھو کہ ہمارے رسول کا کام تمہیں خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے اور بس!

ابتدائے اسلام میں قانون سازی

قانون سازی زیادہ تر نئے حوادث و وقائع کے پیدا ہونے کی مناسبت سے ہوتی تھی۔ جھگڑنے والے رسول اللہ صلعم کی خدمت میں فیصلے کے لئے آتے۔ ایک آیت یا چند آیات جو اس کا فیصلہ کرتیں نازل ہو جاتیں۔ مثال کے طور پر یہ واقعہ لیجئے کہ قبیلۂ غطفان کے ایک آدمی کے پاس اس کے ایک یتیم بھتیجے کا بہت سا مال تھا۔ جب یتیم بھتیجا بالغ ہو گیا تو اس نے اپنے مال کا مطالبہ کیا۔ چچا نے مال دینے سے انکار کیا۔ یہ جھگڑا

فیصلہ کے لئے رسول اللہ صلعم کے سامنے لایا گیا تو یہ آیت نازل ہوگئی وَاٰتُوا الْیَتٰمٰۤی اَمْوَالَھُمْ (اور یتیموں کو ان کے اموال لوٹا دو)[1] الآیہ۔ یا مثلاً اس قصہ کو لیجئے کہ مدینہ والوں میں — زمانہ جاہلیت اور ابتدائے اسلام میں — یہ دستور تھا کہ جب کوئی مرجاتا اور اپنی بیوی کو چھوڑ جاتا تو کسی دوسری بیوی سے اس کے شوہر کا بیٹا یا میت کے عصبات میں سے اس کا کوئی قرابت دار آتا اور میت کی بیوی پر اپنا کپڑا ڈال دیتا اور ایسا کرنے کے بعد وہ اس کا حقدار بن جاتا۔ اگر اس کا جی چاہتا تو اس بیوہ سے خود شادی کر لیتا۔ اسے مہر دینے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ متوفی اسے جو مہر دے چکا تھا وہی کافی سمجھا جاتا۔ جی چاہتا تو کسی غیر آدمی سے اس کی شادی کر دیتے اور اس غیر آدمی سے مہر لے کر خود کھا جاتے اور بیوہ کو کچھ بھی نہ دیتے۔ جی چاہتا تو اسے معلق لٹکائے رکھتے اور ستاتے تاکہ وہ اس حصۂ وراثت سے دست بردار ہو جائے جو اسے اپنے مرنے والے شوہر سے ملا ہے۔ اگر دست بردار نہ ہو تو گھٹ گھٹ کر مرجائے تاکہ یہ لوگ اس مال کے وارث ہو جائیں۔ ابوقیس بن الاسلت انصاری کا انتقال ہوا جنھوں نے اپنی بیوی کبیشہ کو اپنے بعد چھوڑا۔ دوسری بیوی سے ابوقیس کا ایک لڑکا کھڑا ہوا اور اس نے کبیشہ پر اپنا کپڑا ڈال دیا اور اس طرح اس کے نکاح کا وارث بن گیا۔ پھر اسے یونہی ڈالے رکھا۔ نہ خود اس سے شادی کی اور نہ نان نفقہ دیا اور اسے تنگ کرنا شروع کیا تاکہ جو مال اسے اپنے مرنے والے شوہر سے وراثت میں ملا تھا۔ وہ اسے اس لڑکے کو دے کر اپنا پیچھا چھڑا لے۔ کبیشہ رسول اللہ صلعم کے پاس آئی اور اپنا سارا قصہ سنایا۔ آپ نے اس سے فرمایا کہ انتظار کرو تا آنکہ خدا تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ فرما دے۔ مدینہ منورہ کی عورتوں نے یہ سنا اور رسول اللہ صلعم کے پاس ان کا تانتا بندھ گیا اور سب نے آکر شکایت کرنی شروع کی اور بتایا کہ ان سب کا وہی حال ہے جو کبیشہ کا ہے[2] تو حق تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں۔

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ کَرْھًا وَلَا
تَعْضُلُوْھُنَّ لِتَذْھَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَیْتُمُوْھُنَّ ...... الآیہ

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! تمہارے لئے یہ کسی طرح حلال نہیں کہ تم عورتوں کے زبردستی (ان کی مرضی کے بغیر) وارث بن جاؤ۔ اور ان کے نکاح کرنے پر بندشیں نہ لگاؤ تاکہ تم ان سے وہ اموال واپس لے سکو جو تم نے انھیں مہر یا وراثت میں دیئے ہیں۔

بعض اوقات کوئی جزئی واقعہ پیش آتا تھا جس کا تقاضا ہوتا تھا کہ چند ایسی آیات نازل ہو جائیں جو اس پورے موضوع کے احکام کی وضاحت کریں جیسا کہ میراث کی دونوں آیتوں میں آپ دیکھ سکتے ہیں۔

یَسْتَفْتُوْنَکَ۔ قُلِ اللّٰہُ یُفْتِیْکُمْ فِی الْکَلٰلَۃِ اِنِ امْرُؤٌا ھَلَکَ لَیْسَ لَہٗ

---

[1] یہ بحث بڑی اہم ہے۔ اس کے متعلق مضمون کے آخر میں ہمارا استدراک ملاحظہ کیجئے۔ (طلوعِ اسلام)

[2] بعض کتابوں میں ان صحابیہ کا نام کبیشہ اور بعض میں کبشہ آیا ہے۔ یہ دونوں ایک ہی عورت کے نام ہیں جیسا کہ اصابہ میں ابن حجر نے تصریح کی ہے۔

وَلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ......، الآیہ

اے پیغمبر اسلام! لوگ آپ سے فتویٰ پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ کلالہ کے بارے میں خدا تمہیں فتویٰ دیتا ہے کہ اگر کوئی ایسا آدمی مرجائے جس کے اولاد نہ ہو البتہ اس کی کوئی بہن ہو تو بہن کو ترکہ کا نصف حصہ ملے گا۔

جبتک کوئی صریح حکم نہ دیا جاتا لوگ جاہلیت کے رواج پر عمل کرتے رہتے تھے

شاید آپ نے کبیشہ کے حادثہ میں یہ بھی دیکھا ہوگا کہ لوگ —— حتیٰ کہ مدینہ منورہ میں بھی —— ان معاملات میں جن میں ابھی کوئی اسلامی حکم نازل نہ ہوا ہو اسی پرانے طریقہ پر عمل کرتے رہتے تھے جو زمانہ جاہلیت سے ان کے ہاں چلا آرہا تھا تاآنکہ اسلام اس میں کوئی تبدیلی کر دیتا یا اسے برقرار رکھنے کا حکم دے دیتا بلکہ روایات میں تو یہاں تک ملتا ہے کہ بعض وہ لوگ بھی جو اپنی نسبت اسلام کی طرف کرتے تھے —— مدینہ منورہ کے ابتدائی دور میں —— اپنے معاملات میں جاہلی طریقہ پر چلنا ہی پسند کرتے تھے چنانچہ طبری میں ہے کہ ایک انصاری آدمی کا جس کا نام قیس تھا کسی معاملہ میں ایک یہودی سے جھگڑا ہوگیا معاملہ بڑھا تو دونوں مدینہ کے ایک کاہن کی طرف فیصلہ لینے کے لئے چلے اور نبی اکرم صلعم کے پاس نہیں گئے۔ یہودی برابر تقاضا کر رہا تھا کہ نبی اکرم صلعم کے پاس چلو کیونکہ اسے یقین تھا کہ آپ اس پر زیادتی نہیں فرمائیں گے لیکن انصاری اس کی یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ انصاری اپنے آپ کو مسلمان کہتا تھا مگر فیصلہ کے لئے یہودی کو کاہن کے پاس لے جانے پر مصر تھا آخر یہ آیات نازل ہوئیں۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَن يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَن يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَن يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا

یہاں تک کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝

اے پیغمبر اسلام! کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو کہتے تو یہ ہیں کہ وہ اس کتاب پر ایمان لائے ہیں جو آپ پر نازل کی گئی ہے۔ اور ان کتابوں پر بھی ایمان لائے جو آپ سے پہلے نازل کی گئی تھیں مگر اپنے معاملات کے فیصلے کے لئے غیر خدائی طاقتوں کے پاس جانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ انھیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ ان غیر خدائی طاقتوں کا انکار کریں۔ در اصل شیطان چاہتا ہے کہ انھیں بڑی دور کی گمراہی میں مبتلا کردے

...... نہیں تیرے پروردگار کی قسم یہ لوگ اس وقت تک مومن کہلانے کے مستحق نہیں جب تک اپنے تمام اختلافی معاملات میں تمہیں حکم نہ بنائیں۔ اور آپ کے فیصلے سے اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور سرِ تسلیم خم نہ کردیں۔)

دوسرے مقام پر ہے۔

أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ ؟ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ ؟

کیا یہ لوگ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں اور ان لوگوں کے لئے جو ایمان و یقین کی دولت رکھتے ہوں۔ اللہ سے بہتر کون فیصلہ کرنے والا ہے۔

شاید یہ وہ پہلی آیات ہیں جن کے ذریعہ مسلمانوں پر واجب کہا گیا ہے کہ وہ معاملات میں اسلامی احکام کی طرف رجوع کیا کریں۔

جوں جوں جماعتِ مومنین ارتقائی مدارج طے کرتی گئی ان کو قوانین ملتے گئے

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں احکام سے متعلق آیتیں مسلمانوں کی جماعت کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ نازل ہوتی تھیں۔ اگر ہم احکام سے متعلق آیات کے نزول کی تاریخ معلوم کرسکیں اور پتہ لگا سکیں کہ کس طرح حوادث و وقائع کے تسلسل میں قرآنی آیات نازل ہوتی تھیں تو ہم نہایت صحیح طور پر مسلمانوں کی اجتماعی حالت اور ان کی درجہ بدرجہ ترقی کا تعین کرسکتے ہیں۔ ساتھ ہی مجمل اور مفصل، مطلق اور مقید آیات کو صحیح طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ شاید امام شاطبی نے اپنی کتاب "موافقات" میں انہی الفاظ سے اسی مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے کہ "مدنی سورتوں کو مکی سورتوں پر منطبق کرکے اور اسی طرح مکی آیات کو دوسری مکی آیات پر ترتیب نزول کے مطابق منطبق کرکے سمجھنا چاہیئے......"[1]

مکہ مکرمہ میں اسلام کی دعوت پھر مدینہ منورہ کے ابتدائی عہد اسلام میں جنگ اور جہاد کی اجازت، پھر اس کے بعد جنگی احکام میں توسیع۔ مکہ مکرمہ میں بغیر کسی تحدید و تقدیر کے عام انداز پر زکوٰۃ کا حکم پھر مدینہ منورہ میں مقدار زکوٰۃ کی تحدید اور اس کے مصارف کی تعیین۔ یہ سب باتیں ــــ اور اس کی مثالیں بکثرت ہیں ــــ جماعت مسلمین کے نشو و ارتقاء کے ماتحت پیش آئی تھیں۔ قوانین مسلمانوں کی حالت کے مطابق نازل ہوتے تھے۔ یہی کچھ ان آیات کے متعلق بھی کہا جاسکتا ہے جو ابتداء میں یہودیوں کے ساتھ صلح و امن کے ساتھ رہنے سے متعلق ہیں۔ اس کے بعد وہ آیات ہیں جن میں یہودیوں کے ساتھ سختی برتنے اور جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جبکہ یہودیوں نے مسلمانوں کے ساتھ اپنی عداوت کا مظاہرہ کیا۔ بلکہ اسلام نے لوگوں کو ان جاہلی عادات پر بھی ایک دم سے نہیں روکا جنہیں وہ پسند نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ تالیف قلب اور مہلت کے طور پر ایک عرصہ تک شراب سے ممانعت نہیں کی گئی۔ حتیٰ کہ جب مسلمانوں میں پختگی آگئی اور اوامر و نواہی کی تنفیذ ممکن ہوگئی تو اس قسم کے احکام نازل کئے گئے۔

نسخِ آیات

یہ درجہ بدرجہ آگے بڑھنا اور جماعت مسلمین کی حالت کی رعایت ہی وہ چیز ہے جو جوازِ نسخ کی علت کی

[1] الموافقات ص ۴۴، ۲۴۰۔ ج ۲

تشریح کر دیتی ہے یہ ایسی چیز ہے جس کا قوانین الٰہیہ اور قوانین وضعیہ سب میں لحاظ رکھا جانا ضروری ہے[1]۔ قرآن کریم میں ہے

مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا

ہم کسی آیت کو منسوخ نہیں کرتے یا موخر نہیں کرتے مگر اس سے بہتر یا اس جیسی آیت لے آتے ہیں

اور دوسری جگہ ہے

وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَّكَانَ آيَةٍ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوا إِنَّمَا أَنتَ مُفْتَرٍ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ

جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت لے آتے ہیں اور خدا خوب جانتا ہے کہ وہ کیا نازل کر رہا ہے تو لوگ کہتے ہیں تو اس کے سوا اور کیا ہے کہ ایک افترا کرنے والا ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اکثر لوگ جانتے ہی نہیں۔

نسخ کی تفسیر میں امام طبری کہتے ہیں کہ نسخ اسے کہتے ہیں کہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال۔ مباح کو مکروہ اور مکروہ کو مباح میں تبدیل کر دیا جائے۔ علماء نے جواز نسخ کی علت یہی بتائی ہے کہ مختلف اوقات پر مصالح مختلف ہوتی ہیں۔ اسلامی شریعت میں عملاً اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ عورتوں کو ابتداءً حکم دیا کہ ان کا شوہر مر جائے تو وہ ایک سال کی عدت گذاریں۔

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِم مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ

تم میں سے جو لوگ مر جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں انہیں اپنی بیویوں کے لئے ایک سال کی وصیت کر دینی کہ سال بھر تک ان کی خبر گیری کی جائے۔

لیکن آگے چل کر چار مہینے کی مدت کے حکم سے اسے منسوخ کر دیا گیا۔ چنانچہ یہ حکم آ گیا۔

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا

تم میں سے جو لوگ مر جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں انہیں اپنے نفسوں کے ساتھ چار مہینے دس دن انتظار کرنا چاہئے

ایسے ہی حدیث میں بھی ہوا ہے۔ مثلاً یہ حکم ملتا ہے کہ "میں نے تمہیں قربانی کے گوشت کا ذخیرہ کرنے سے منع کیا تھا۔ لیکن اب اس کا ذخیرہ کر سکتے ہو" اور یہ حکم کہ میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا مگر اب ان کی زیارت کر سکتے ہو"

امام شاطبی نے بالکل صحیح کہا ہے کہ مکہ کے احکام و قوانین میں بہت کم نسخ ہوا ہے۔ اس کی وجہ وہی ہے جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ مکہ مکرمہ میں دین کے اصول مثلاً توحید، بتوں کو چھوڑ دینا، مکارم اخلاق کی طرف دعوت وغیرہ چیزیں نازل ہوتی تھیں اور

---

[1] یہ عقیدہ قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔ مقالہ کے آخر میں ہمارا استدراک نمبر ۲ دیکھئے۔

ان میں نسخ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نسخ کبھی ہوتا ہے تو وہ دین کے تفصیلی احکام میں ہوتا ہے۔ یہ چیز مدینہ منورہ ہی میں ہوئی تھی۔

احکام سے متعلق آیات میں قرآن کریم ان تمام انواع اعمال سے تعرض کرتا ہے جو انسان سے سرزد ہوتے ہوں۔ عبادات، مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج۔ امور معیشت مثلاً بیع و فروخت، اجارہ، سود۔ تعزیراتی امور مثلاً قتل، چوری، زنا، ڈاکہ۔ عائلی معاملات مثلاً نکاح، طلاق، میراث وغیرہ۔ ملکی و جنگی حالات و ظروف مثلاً جنگ و امن، محاربین کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات، باہمی معاہدات، جنگ کے اموال غنیمت ـــــ وہ ان تمام امور میں زیادہ تر جزئی تفاصیل سے تعرض نہیں کرتا بلکہ بیشتر کلی امور کو بیان کرتا ہے چنانچہ وہ مثلاً نماز میں اس کے اوقات اور ہیئت سے کوئی تعرض نہیں کرتا اور زکوٰۃ میں مقدار واجب اور انواع واجبات سے کوئی تعرض نہیں کرتا۔ یہی حال دوسرے ابواب کا ہے۔ قرآن کریم نے ان معاملات کو رسول پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ ان کی اپنے قول و فعل سے تشریح و توضیح کر دیں۔

تجدید و اصلاح

اسلام نے قانون سازی کے اکثر احوال میں تجدید و اصلاح سے کام لیا ہے۔ نظام جاہلی میں اس نے بہت سی تبدیلیاں کیں اور انھیں معتدل بنایا جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔ اسلام بیویوں کی تعداد کم کرتا ہے۔ عورتوں کی آزادی اور حریت میں اضافہ کرتا ہے۔ نکاح و طلاق میں اکثر جاہلی عادات میں تبدیلیاں کرتا ہے۔ وراثت کا ایک خاص نظام مقرر کرتا ہے جو جاہلی نظام کے خلاف ہے۔ عرب کے لوگ جاہلیت میں ـــــ مثال کے طور پر ـــــ عورتوں کو وراثت میں حصہ نہیں دیتے تھے۔ اور نہ ہی میت کی اولاد میں سے چھوٹے بچوں کو۔ وہ صرف ان لوگوں کو وراثت میں حصہ دیتے تھے جو دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہوں اور جنگ میں حصہ لے سکتے ہوں۔[۱] اسلام نے عورتوں کو وراثت میں حصہ دلوایا تو یہ بات لوگوں کو بہت ناگوار گذری۔ ابن عباسؓ نے نقل کیا ہے کہ جب میراث کے احکام نازل ہوئے تو اللہ نے ان میں لڑکوں لڑکیوں اور والدین کے حصے رکھے تھے۔ ان لوگوں نے ناپسند کیا اور کہنے لگے کہ بیوی کو چوتھائی اور آٹھواں حصہ دیا جائے گا۔ لڑکی کو آدھا حصہ دیا جائے گا۔ اور چھوٹے بچے کو بھی دینا پڑے گا۔ حالانکہ ان میں سے کوئی بھی نہ جنگ کرتا ہے اور نہ مال غنیمت حاصل کرتا ہے...... الخ[۲] یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے عورت کو اس کا حصہ دینے کی تاکید کی ہے اور بار بار اس کا ذکر کیا ہے ـــــ یہی حال ان تمام احوال و ظروف کا ہے جن کے احکام قرآن نے بیان کئے ہیں۔ ہم یہاں ان تمام احکام کو بیان نہیں کر سکتے جنھیں قرآن نے مقرر کیا ہے۔

سنت سے قانون سازی

رسول اللہ صلعم کے عہد میں قانون سازی کی ایک اور نوع بھی تھی اور یہ سنت کے ساتھ قانون سازی تھی۔ کتاب اللہ اور سنت میں فرق یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ اور

۱؎ طبری ص ۱۸۵ ج ۴ ۲؎ طبری ص ۱۸۶ ج ۴

معانی سب خدا کی طرف سے وحی ہوتے ہیں اور سنت کے الفاظ رسول کی طرف سے ہوتے ہیں۔ سنت یا احادیث رسول نے بہت سی قرآنی آیات کی توضیح و تشریح کی ہے جیسا کہ آپ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کی آیات میں دیکھ چکے ہیں۔ چنانچہ قرآن نے صلوٰۃ کی اشکال اور اس کے اوقات کی تعیین نہیں کی۔ زکوٰۃ میں اس کی واجب مقدار اور اس کی شرائط کا تعین نہیں کیا۔ ان تمام چیزوں کو رسول نے اپنے قول اور عمل سے واضح کیا تھا۔ بہت سے ایسے وقائع پیش آئے اور جھگڑے ہوئے جن کا فیصلہ نبی اکرم صلعم نے حدیث سے کیا۔ قرآن سے نہیں کیا۔ آپ کے یہ فیصلے قانون سازی ہی تھی۔ لہٰذا وہ تمام باتیں جو نبی صلعم نے فرمائیں یا کیں یا آپ کے سامنے ہوئیں اور آپ نے انھیں پسند فرمایا سب کی سب قانون سازی کا حکم رکھتی ہیں۔ جب یہ باتیں رسول اللہ صلعم سے ثابت ہو جائیں تو قوت کے اعتبار سے وہ بمنزلہ قرآن کے ہوتی ہیں لیکن ایسا بہت ہی کم ہے کہ ان باتوں کا ایسا ثبوت مل جائے جن میں شک کا احتمال نہ ہو کیونکہ حدیث پر گفتگو کرتے ہوئے ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ یہ بات صرف حدیث متواتر کو حاصل ہو سکتی ہے جس کا کوئی وجود نہیں ہے۔

رسول اللہ صلعم کے اجتہادی فیصلے سنت کہلاتے ہیں

اسی سلسلہ میں وہ بات بھی کہی جاتی ہے جسے اکثر علمائے اصول نے پسند کیا ہے اور وہ یہ کہ جہاں وحی کا کوئی حکم نہیں ہوتا تھا وہاں رسول اللہ صلعم اپنی رائے سے اجتہاد فرماتے تھے۔ اور بعض اوقات آپ کی اس اجتہادی رائے میں غلطی بھی ہو جاتی تھی۔ اس بات پر ان حضرات نے اس سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ صلعم پر بدر کے اسیران جنگ کے بارے میں عتاب فرمایا گیا تھا۔ مَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنۡ یَّکُوۡنَ لَہٗۤ اَسۡرٰی حَتّٰی یُثۡخِنَ فِی الۡاَرۡضِ نبی کے لئے یہ زیبا نہیں تھا کہ وہ اسیران جنگ کو لے کر آجائے جب تک وہ زمین میں اچھی طرح قتل و خون کی گرم بازاری نہ کرلے۔ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلعم کو ان قیدیوں کو قتل کر دینے کا مشورہ دیا تھا۔ اگر رسول اللہ صلعم نے تقاضائے وحی کے مطابق فیصلہ فرمایا ہوتا تو عتاب کے کوئی معنے نہیں ہیں۔ روایت یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم نے مکہ کے بارے میں فرمایا تھا۔ اس کی جھاڑیاں اور درخت نہ کاٹے جائیں۔ اس پر حضرت عباسؓ نے عرض کیا کہ اے رسول اللہ اذخر کا استثناء ہونا چاہیئے تو آپ نے اذخر کا استثناء فرما دیا۔ ایک جنگ میں آپ نے ایک مقام پر قیام فرمایا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ اگر آپ نے اس مقام پر وحی کے مطابق پڑاؤ ڈالا ہے تب تو بسر و چشم۔ لیکن اگر یہ آپ کی اپنی رائے اور اجتہاد ہے تو یہاں پڑاؤ ڈالنا جنگی چال کے مطابق مناسب نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں یہاں کا پڑاؤ میری اپنی رائے کے مطابق ہے اور وہاں سے آپ نے پڑاؤ اٹھا دیا۔ نیز حجۃ الوداع کے موقعہ پر آپ نے فرمایا تھا کہ اگر میں پہلے سے وہ چیز سمجھ لیتا جو بعد میں سمجھ میں آئی تو میں ہدی لے کر نہ آتا۔ نیز نبی اکرم صلعم نے فرمایا کہ تم میرے پاس جھگڑے لے کر آتے ہو۔ شاید تم میں کوئی دوسرے سے زیادہ چرب زبان ہو اور میں اس کی بات سے متاثر ہو کر اس کے حق میں فیصلہ دیدوں۔ لیکن اگر اس طرح میں کسی کے حق میں غلط فیصلہ دیدوں اور اس کے بھائی کا حق اسے دلوا دوں تو اس طرح میں اسے آگ کا ایک ٹکڑا دلوا رہا ہوں۔ لیکن علماء نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ نبی صلعم کو

غلطی پر باقی نہیں رکھا جاتا تھا۔ لہٰذا جہاں آپ نے اجتہاد فرمایا ہو اور آپ کو اس اجتہاد پر برقرار رکھا گیا ہو — اس میں کوئی شبہ نہیں کہ — وہ حجت ہے۔[1]

احکام سے متعلق احادیث کثیر التعداد ہیں اور ان تمام انواع میں وارد ہوئی ہیں جن میں قرآن نازل ہوا ہے۔ چنانچہ اس طرح ان احادیث نے قرآن کے مجمل کی توضیح کردی ہے۔ کہیں اس کے مفصل احکام کو مقید کر دیا ہے اور کہیں بہت سی باتوں کا اضافہ کر دیا ہے جنھیں قرآن نے بیان نہیں کیا تھا۔ علماء قدیم زمانہ سے حدیثوں کو جمع کرنے اور فقہی ترتیب کے مطابق مرتب کرنے میں لگے رہے ہیں۔[2]

اسلامی قانون کی بنیاد الٰہی ہے

یہ دونوں بنیادی چیزیں — کتاب اور سنت — رسول اللہ صلعم کے عہد میں قانون سازی کا سرچشمہ تھیں یہیں سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلامی قانون کی بنیاد الٰہی ہے، جس کا سرچشمہ خدا ہے جو کتاب اور حدیث کے ذریعہ اپنے احکام و قوانین کی تعیین کرتا ہے۔[3] کسی اقتدار اعلیٰ کو نہ اس کی مخالفت کا حق ہے اور نہ اس کی نصوص سے باہر نکلنے کا۔ جہاں کوئی نص نہ ہو وہاں مجتہدین اجتہاد کر سکتے ہیں۔ اپنے اس اجتہاد میں انھیں ان قواعد کلیہ سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیئے جو کتاب و سنت میں وارد ہوئے ہیں۔ وضعی قوانین اور الٰہی قوانین میں فرق یہی ہے کہ وضعی قوانین میں قانون سازی کا اقتدار پوری طرح پر آزاد ہوتا ہے کہ وہ جس طرح چاہے قانون کی تغییر کرے۔ جس طرح چاہے اسے معتدل بنادے۔ اور جب چاہے اسے بالکل ختم کر دے۔ لیکن الٰہی قوانین میں یہ صورت نہیں ہوتی۔ فقہاء اور خلفاء کی آزادی نصوص قرآنیہ کو سمجھنے کے دائرہ میں محدود ہوتی ہے۔ اور اس پر کہ حدیث پر کس حد تک اعتماد کیا جائے یا اعتماد نہ کیا جائے۔ نیز ان معاملات میں قانون بنانا جن کے متعلق کتاب اور سنت صحیح میں کوئی حکم نہ ملتا ہو۔

رسول اللہ صلعم کی وفات ہوگئی۔ اور وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ مملکت اسلامیہ کو اتنی بڑی اور اتنی تیزی کے ساتھ حیرتناک طریقہ پر وسعت نصیب ہوئی جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ ۱۳ھ میں دمشق فتح ہوا۔ ۱۶ھ میں عراق اور شام کی فتوحات مکمل ہو گئیں

اسلام کی وسیع فتوحات

۲۱ھ میں ایران کی فتح مکمل ہو گئی۔ ۵۲ھ میں مسلمان سمرقند تک پہونچ گئے۔ مغرب کی طرف ۲۰ھ میں مصر لے لیا گیا اور پھر مغرب میں فتوحات بڑھتی گئیں تا آنکہ ۹۳ھ میں اسپانیا لے لیا گیا۔ مسلمانوں کو مال و دولت اور اسیران جنگ اور اسباب عیش و تنعم کی صورت میں وہ فراغت نصیب ہوئی جو اس سے پہلے ان کے

---

[1] ملاحظہ ہو المستصفیٰ للغزالی صفحہ ۲۵۵ ج ۲

[2] اس قسم کی ترتیب سب سے پہلے امام بخاری نے اپنی صحیح میں اختیار کی۔ اس باب میں سب سے بہترین تصنیف شوکانی کی نیل الاوطار ہے جس میں وہ تمام حدیثیں شامل ہیں جو صحاح ستہ میں آئی ہیں اس کی ترتیب فقہی ابواب کے مطابق ہے امام شوکانی نے اس میں شرح و بسط سے ان احکام کو بیان کر دیا ہے جو ان احادیث سے مستنبط ہوتے ہیں۔

[3] یہ کہنا صحیح نہیں کہ خدا حدیث کے ذریعہ اپنے احکام کی تعیین کر دیتا ہے۔ (طلوع اسلام)

خلافت دمیاں میں بھی نمایاں ہوگی۔ یہ تمام مفتوحہ ممالک قدرتی دولت سے مالا مال تھے اور تہذیب و تمدن کے اس مقام پر تھے جہاں تک اس زمانے میں تہذیب و تمدن کی رسائی ہو سکتی تھی۔ ایرانی تہذیب کا نمونہ عراق اور فارس میں اور رومی تہذیب کا نمونہ مصر اور شام میں

نت نئے حالات

جلوہ فرما تھا۔ اسلامی فتوحات سلب و نہب، لوٹ مار اور تباہی و بربادی کا مظاہرہ نہیں تھا بلکہ وہ ایک منظم فتح کی صورت میں رونما ہو رہا تھا کہ تراء۔ معلم، قانون داں حضرات فوجوں کے ساتھ ساتھ جاتے تھے اور جہاں فوجیں اترتی تھیں ساتھ ہی یہ لوگ بھی اترتے تھے اور فوری طور پر اس علاقے کے لوگوں کی تعلیم و تربیت میں مصروف ہو جاتے تھے۔ ان فتوحات سے مسلمانوں کو بے شمار مسائل کا ــــــ جن کا تعلق زندگی کے تمام احوال و ظروف سے ہوتا تھا ـــــــ سامنا کرنا پڑا جن کے لئے انھیں قانون بنانے کی ضرورت پڑی۔ جزیرۂ عرب میں انھیں ان قوانین کی کبھی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ رہی کا نظام جزیرہ کے نظام سے مختلف اور عراق کے معاملات مصر کے حالات سے مختلف تھے۔ بے شمار مالیاتی پیچیدہ سوالات تھے جن کا ان مالیاتی حالات سے کوئی واسطہ بھی نہیں تھا جن سے وہ اب تک جزیرۃ العرب میں دوچار تھے۔ علاوہ ازیں فوج اور فتوحات کے مسائل، مفتوحین اور فاتحین کے تعلقات کی تعیین، مسلمانوں اور غیر مسلموں سے ٹیکسوں کے سوالات۔ بیاہ شادی کی وہ صورتیں جن سے عربوں کو کبھی واسطہ بھی نہیں پڑا تھا۔ معاملات کے وہ انواع و اقسام جن سے عرب بالکل ناواقف تھے۔ ان جرائم کا سوال جن کے عرب کے باشندے بوجہ اپنی سادہ زندگی کے کبھی مرتکب ہی نہیں ہو سکتے تھے۔ غرضیکہ انھیں تمام خارجی اور داخلی معاملات میں اسی قسم کے سوالات سے دوچار ہونا پڑا۔ عہد اول کے قانون سازوں کو بڑی مشکل در پیش تھی۔ یہ کسی کا بھی دعویٰ نہیں تھا کہ قرآن اور سنت صحیحہ نے صراحت کے ساتھ ان تمام مسائل کو بیان کر دیا ہے جو آج تک ہو چکے ہیں یا آئندہ ہونگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قانون سازی کی ایک اور بنیاد سامنے آئی۔ یہ بنیاد "رائے" تھی جسے بعد میں منظم کر کے قیاس کے نام سے پکارا گیا۔

قانون سازی کی تیسری بنیاد رائے اور قیاس

اس پر بہت سے صحابہ نے عمل کیا۔ چنانچہ جہاں کوئی نص نہیں ملتی تھی وہ اپنی رائے کو کام میں لاتے تھے۔ مورخین، محدثین اور فقہاء نے ایسے بے شمار مسائل بیان کئے ہیں جن میں صحابہ نے اپنی رائے سے کام لیا تھا۔ رسول اکرم صلعم کی ابھی وفات بھی نہیں ہوئی تھی کہ صحابہ نے اپنے آپ کو ایک بڑی قانونی مشکل کے سامنے پایا اور وہ قانونی مشکل یہ تھی کہ رسول اللہ کے بعد اقتدار کس کے ہاتھ میں رہنا چاہیئے۔ مہاجرین کے ہاتھ میں یا انصار کے ہاتھ میں؟ یا ایک امیر ان میں سے ہو اور دوسرا امیر ان میں سے؟ اگر ان باتوں کا بھی فیصلہ ہو جائے تو ہم میں سے وہ بہترین آدمی کون ہے جس کو یہ ذمہ داری سونپی جائے؟ اس بارے میں نہ کتاب میں کوئی تصریح موجود تھی نہ سنت میں۔ صحابہ کے لئے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ اپنی رائے کو کام میں لائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ وہ منظر جس کا مورخین نے سقیفہ بنی ساعدہ کے سلسلہ میں ذکر کیا ہے، ہمیں یہ بتاتا ہے کہ صحابہ نے وہاں کس طرح اپنی رائے سے کام لیا اور کس طرح معاملہ کے تمام پہلوؤں پر غور کیا۔

حضرت ابوبکر ابھی لوگوں کی بیعت سے بھی فارغ نہیں ہوئے تھے کہ ارتداد کا پیچیدہ ترین سوال سامنے آ گیا۔ انھوں نے دیکھا کہ کچھ لوگ باوجود اسلام کا اقرار کرنے اور نمازیں ادا کرنے کے مرکزی حکومت کو زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کر رہے ہیں ایسے لوگوں کے ساتھ کیا

برنا ؤ کیا جائے۔ اس قسم کا کوئی حادثہ نبی اکرم صلعم کی زندگی میں پیش نہیں آیا تھا۔ آخر صحابہ کو رائے کی طرف پناہ لینی پڑی۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ ہم ان سے کس طرح جنگ کر سکتے ہیں جبکہ رسول اللہ صلعم نے ارشاد فرمایا ہے کہ "مجھے لوگوں سے اس وقت جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک وہ لا الٰہ الا اللہ نہ کہہ دیں۔ جب وہ لا الٰہ الا اللہ کہہ دیں تو مجھ سے اپنے خون اور اموال کو وہ محفوظ کر لیتے ہیں بجز اس کے حق کے" ابوبکرؓ نے کہا کہ خود اسی حدیث میں کیا رسول اللہ صلعم نے " اِلَّا بِحَقِّهَا " (بجز اس کے حق کے) نہیں فرمایا؟ جیسا کہ نماز قائم کرنا اسلام کا حق ہے ایسے ہی زکوٰۃ دینا بھی اسلام کا حق ہے۔

اسی طرح ایک مصحف میں قرآن کو جمع کرنے کا خیال ان کے سامنے آیا[1]۔ ابتداءً اس بارے میں ابوبکرؓ اور عمرؓ کی رائے میں اختلاف رہا تا آنکہ خدا نے ابوبکرؓ کا سینہ بھی اس بات کے لئے کھول دیا جو عمرؓ کہہ رہے تھے۔

ان کے سامنے دادا کے ساتھ بھائیوں کی میراث کا سوال پیش آیا کہ کیا بھائی وارث ہونگے؟ قرآن نے اس مسئلہ میں کوئی تصریح نہیں کی۔ البتہ باپ کے ساتھ بھائیوں کی وراثت کو بیان کیا ہے۔ ابن عباسؓ اور ابوبکرؓ اسی طرف گئے کہ دادا بھی باپ کی طرح ان کے لئے حاجب ہو جائے گا۔ لیکن دوسرے حضرات جن میں زید بن ثابتؓ حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ بھی ہیں۔ اس خیال کے حامی تھے کہ دادا کی موجودگی میں بھائی وارث ہونگے۔

انھوں نے لوگوں کو کچھ عطیے دینا چاہے۔ یعنی مختلف جنگوں میں جو مال غنیمت حاصل ہو رہا تھا انھیں تقسیم کرنا چاہا اب اس میں اختلاف ہوا کہ مہاجرین اور انصار کے درمیان انھیں حصہ مساوی تقسیم کر دیا جائے یا کم و بیش؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہم ان لوگوں کو جنھوں نے اپنا وطن اور اموال چھوڑ کر نبی صلعم کی طرف ہجرت کی تھی ان لوگوں کے برابر نہیں کر سکتے جو مجبوراً مسلمان ہوئے تھے۔ ابوبکرؓ نے فرمایا کہ ان کا اسلام لاِ اللہ کے لئے تھا اور اس کا اجر بھی ان کو خدا ہی دے گا۔ رہ گیا دنیا کا معاملہ تو یہاں تو ضرورتوں کو پورا کرنے کا سوال ہے جس میں سب برابر ہیں چنانچہ ابوبکرؓ اپنی اسی رائے پر عمل کرتے تھے اور عطایا سب کو حصہ مساوی دیتے تھے لیکن خلافت جب حضرت عمرؓ تک پہنچی تو انھوں نے فرق کیا اور لوگوں کو ان کے درجوں کے مطابق عطایا دیئے۔ زید بن ثابت کے سامنے جب یہ سوال آیا کہ ایک آدمی مر گیا ہے اور اس نے ایک بیوی اور ماں باپ چھوڑے ہیں تو زید بن ثابتؓ نے باقی تہائی ماں کو دلوا دیا۔ ابن عباسؓ نے ان سے کہا کہ آپ نے بقیہ ثلث کا یہ حصہ کتاب اللہ میں کہاں سے پایا ہے؟ زیدؓ نے کہا کہ تم اپنی رائے سے کہتے ہو اور میں اپنی رائے سے کہتا ہوں۔

کندی کی تاریخ القضاۃ میں ہے کہ عیاض بن عبید اللہ قاضی مصر نے عمر بن عبدالعزیز کو ایک مسئلہ کے بارے میں لکھا حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جواب لکھا کہ اس سلسلہ میں مجھ تک کوئی حدیث نہیں پہنچی لہٰذا اس کا فیصلہ میں تم پر چھوڑتا ہوں۔ اپنی رائے سے فیصلہ دے دو[2]۔ اس سلسلہ میں بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں جن کا ذکر کر کے ہم بات کو طول دینا نہیں چاہتے۔

---

[1] یہ واقعہ صحیح نہیں۔ قرآن خود رسول اللہ کے زمانہ میں جمع و مرتب ہو چکا تھا (طلوع اسلام) [2] صفحہ ۲۲۳

لفظ "رائے" کی تفسیر

مختصر یہ کہ اکثر صحابہ کا یہ خیال تھا کہ جہاں کتاب اور سنت کی کوئی نص موجود نہ ہو وہاں رائے کو کام میں لانا چاہیئے۔ اور اگر قرن اول میں لفظ "رائے" کے استعمال کی تلاش و جستجو کی جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ وہ حضرات اس لفظ کو انہی معنوں میں استعمال کرتے تھے جن معنوں میں ہم آجکل لفظ "عدالت" کو استعمال کر لیتے ہیں۔ بالفاظ دیگر کسی معاملہ میں جس طرف ذوق سلیم رہنمائی کرتا ہے کہ انصاف یا ظلم کا تقاضا یہ ہے تو اس کو رائے کا فیصلہ کہتے ہیں۔ ابن القیم نے لفظ "رائے" کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے۔ "غور و فکر کے بعد دل جس بات پر جم جائے کہ یہی درست فیصلہ ہے"۔ میں آپ کے سامنے چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔ ان سے اس بات کی وضاحت ہو سکے گی کہ وہ حضرات مسائل پر کس طریقہ سے غور فرماتے۔ اور کس طرح الٹ پھیر کر اسے سمجھتے اور کس انداز سے اپنی رائے کو کام میں لاتے تھے۔ مثلاً حضرت عمرؓ نے جب دادا اور بھائیوں کی میراث کے بارے میں صحابہ سے مشورہ کیا تو زید بن ثابتؓ اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ــــ میری ان دنوں یہ رائے تھی کہ دادا بھائیوں

صحابہ کس طرح رائے کا استعمال کرتے تھے؟

کی بہ نسبت اپنے پوتے کی میراث کا زیادہ حقدار ہے ــــ میرے اور حضرت عمرؓ کے درمیان شدید بحث ہوئی۔ میں نے حضرت عمرؓ کے سامنے ایک مثال پیش کی اور کہا کہ اگر ایک درخت کی جڑ سے ایک شاخ نکل آئے اور پھر اس شاخ میں دو نئی ٹہنیاں نکل آئیں یہ دونوں ٹہنیاں اس شاخ سے تعلق رکھتی ہیں جڑ سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں اور وہ شاخ ہی ان کو غذا پہنچاتی ہے۔ امیرالمومنین! آپ غور فرمایئے کہ یہ دونوں ٹہنیاں اصل کی نسبت ایک دوسری سے زیادہ قریب ہیں۔ زیدؓ کہتے ہیں کہ میں برابر حضرت عمرؓ کو سمجھاتا اور ایک سے ایک نئی مثال پیش کرتا رہا۔ مگر حضرت عمرؓ کی سمجھ میں نہیں آیا اور وہ برابر یہی فرماتے رہے کہ بھائیوں کی بہ نسبت دادا زیادہ قریب ہے[1]

---

[1] اعلام الموقعین ص ۲۵۶ ج ۱

نوادرات

علامہ اسلم جیراجپوریؒ کے مقالات کا نادر مجموعہ

بڑا سائز ۔۔۔ ۳۰۰ صفحات قیمت ۳۰ روپے

روزے کے احکام

چونکہ رمضان المبارک کا مہینہ قریب آرہا ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ معمول کے مطابق[1] قرآن کی رُو سے روزے کے احکام مختصر الفاظ میں بیان کر دیئے جائیں۔ یہ احکام سورۃ البقرہ میں آئے ہیں۔ متعلقہ آیات یہ ہیں۔

(۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝

(۱) اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! جس طرح تم سے پہلی قوموں پر روزہ فرض کیا گیا تھا اسی طرح تم پر بھی روزہ فرض کر دیا گیا ہے۔ تاکہ تم قانونِ خداوندی کی نگہداشت کر سکو۔

(۲) أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ

(۲) یہ روزے چند گنے ہوئے دنوں کے ہیں۔

(۳) فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ

(۳) پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کرے۔

(۴) وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ

(۴) اور جو لوگ بدشواری روزہ رکھ سکیں ان کے لئے روزے کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا کافی ہے

(۵) فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

(۵) اس کے بعد بھی اگر کوئی اپنی خوشی سے زیادہ کرے تو مزید اچھا ہوگا۔ اگر تم سمجھ بوجھ سکتے ہو تو تمہارے لئے روزہ رکھنا بہتر ہے۔

(۶) شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ...

(۶) روزے رمضان کے مہینے کے ہیں جس میں قرآن نازل کیا گیا۔

(۷) فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ (۲/۱۸۳-۱۸۵)

(۷) لہٰذا تم میں سے جو کوئی اس مہینہ میں اپنے گھر پر موجود ہو تو اسے اس مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں۔ البتہ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں سے گنتی پوری کرے۔

---

[1] ان احکام کو ہم اس سے پہلے بھی کئی بار درج کر چکے ہیں۔ لیکن ہم ان کے اعادہ کی ضرورت ہر سال سمجھتے ہیں۔ اس لئے انہیں پھر دہرایا جا رہا ہے۔

ان آیات سے معلوم ہو گیا کہ

(۱) روزے رمضان کے مہینے کے ہیں (تین دن یا دس دن کے نہیں۔ پورے مہینے کے)

(۲) روزے اس کے لئے ہیں کہ جو اس مہینہ میں اپنے گھر پر موجود ہو اور تندرست ہو۔ مریض تندرست ہونے پر اور مسافر سفر سے واپسی پر دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کرے۔

(۳) اب ایک شکل اور باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ ایک شخص (عام عرفی معنوں میں) نہ تو بیمار ہے اور نہ مسافر ہے لیکن کسی وجہ سے اسے روزے رکھنے دشوار ہیں۔ مثلاً ایک بوڑھا آدمی اپنے گھر پر موجود ہے۔ اور مریض بھی نہیں لیکن بڑھاپے کی وجہ سے کمزور اتنا ہے کہ بمشکل روزہ رکھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ رمضان کے بعد دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کرے۔ ایسے لوگوں کا حکم نمبر ۳ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ جو لوگ ایسے ہوں کہ بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں انہیں اپنے آپ کو دشواری میں ڈالنے کی ضرورت نہیں وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔

غور فرمائیے اوپر کی تینوں شقوں میں ہر قسم کے حالات جمع ہو گئے ہیں اور یہی احکام کی جامعیت کا تقاضا تھا۔

ہم نے وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ کا ترجمہ ——— وہ لوگ جو بدشواری روزہ رکھ سکیں ——— کیا ہے حالانکہ اس کا عام ترجمہ ——— اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں ——— کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ صحیح نہیں اس لئے کہ اس ترجمہ کی رو سے مطلب یہ ہوگا کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں۔ وہ تو ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں اور جن میں روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہ ہو وہ روزے رکھا کریں۔ حالانکہ قرآن کا منشا یہ نہیں ہو سکتا۔ بات یہ ہے کہ لفظ "طاقت" کا جو مفہوم ہمارے ہاں اردو میں رائج ہے وہ اس سے مختلف ہے۔ جو عربی زبان میں اس کا مفہوم ہوتا ہے۔ ہمارے مترجمین نے عربی کے لفظ "طاقت" کا ترجمہ اردو کے لفظ "طاقت" سے کر دیا اور دونوں زبانوں کے مفہوم میں جو فرق تھا۔ اسے نظر انداز کر گئے عربی زبان میں اس لفظ کا کیا مفہوم ہوتا ہے۔ اس کے لئے عربی زبان کی لغات دیکھئے۔ محیط المحیط جلد دوم صفحہ ۱۳۰۳ میں ہے۔

> طاقت کے معنی کسی چیز پر قدرت رکھنا ہیں۔ لیکن یہ قدرت کی ایسی مقدار کو کہتے ہیں کہ جسے انسان بمشقت کر سکتا ہے۔ دراصل یہ لفظ اس طوق سے ماخوذ ہے جو کسی چیز کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ کے معنی یہ نہیں کہ جس کی ہمیں قدرت نہ ہو بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کا بجا لانا ہمیں دشوار ہو۔

اسی طرح عربی کی مشہور لغت لسان العرب صفحہ ۱۰۳ ج ۱۲ میں ہے کہ

> طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جو کسی انسان کے لئے بمشقت کرنا ممکن ہو۔

مفتی محمد عبدہ اپنی تفسیر المنار صفحہ ۱۵۵ ج ۲ پر لکھتے ہیں کہ

> [طَاقَةٌ دراصل مُکْنَتْ اور قُدْرَتْ کے بالکل ادنیٰ درجہ کا نام ہے۔ چنانچہ عرب

> اَطَاقَ الشَّیْءَ صرف اس وقت کہتے ہیں جب اس کی قدرت نہایت ہی ضعیف ہو یعنی بدشواری اسے برداشت کرسکتا ہو۔ چنانچہ یُطِیْقُوْنَہٗ سے مراد بوڑھے، ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار کے دور ہو جانے کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اور وہ لوگ ہیں جو ان ہی کی طرح معذور ہیں۔ یعنی ایسے کام کاج کرنے والے لوگ جن کی معاش اللہ نے پُرمشقت کاموں میں رکھ دی ہے..... اسی بنا پر امام راغب نے لکھا ہے کہ طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جس کا کرنا انسان کے لئے بمشقت ممکن ہو۔

اسی کی تائید تفسیر کشاف سے بھی ہوتی ہے جس میں لکھا ہے کہ۔

> طَاقَۃٌ کے مفہوم میں وہ کام آتے ہیں جنھیں بتکلیف یا بمشقت کیا جاسکے اور وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ سے مراد بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں ہیں جن کے لئے روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے کا حکم ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر یہ آیت ثابت ہے، منسوخ نہیں ہے۔
>
> (تفسیر کشاف ص۲۵۵ ج ۱)

تفسیر روح المعانی میں ہے کہ

> عربی زبان میں اَلْوُسْعُ کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو سہولت کے ساتھ ہو اور طاقۃٌ کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو شدت اور مشقت کے ساتھ ہو۔ لہٰذا آیۂ زیر نظر کا معنی یہ ہوگئے اور ان لوگوں پر جو شدت اور مشقت کے ساتھ روزہ رکھ سکتے ہیں، ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے.....
>
> (روح المعانی ص۵۹ ج ۲)

تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ عربی زبان میں لفظ "طَاقَۃٌ" کا مفہوم کیا ہے اور اس بنا پر وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ کا ترجمہ ــــــ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں ــــــ کردینا کس قدر غلط فہمیوں کا موجب ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس کا ترجمہ ــــــ اور جو لوگ بدشواری روزہ رکھ سکیں ــــــ کیا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ایک اصول بیان کردیتا ہے اور اسے امت کے اجتماعی نظام پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اس کی جزئیات خود متعین کرے۔ چنانچہ عَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ میں بھی یہی اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں ایک اصول بیان کردیا گیا ہے اور اس کی تفصیلات خود بیان نہیں کیں (کہ وہ لوگ کون ہیں جو بمشقت روزہ رکھ سکتے ہیں) اس کی تفاصیل پہلے بھی متعین کی جاچکی ہیں، اور ان پر اب بھی غور کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ علامہ قرطبی کی کتاب "جامع احکام القرآن" ــــــ (ص۲۶۵-۲۹۹ ج ۲) میں ہے کہ

> تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں جو روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہیں

رکھتے یا شدید مشقت کے ساتھ طاقت رکھتے ہیں۔ ان کے لئے روزہ نہ رکھنا جائز ہے۔ مگر اس میں اختلاف ہے کہ ایسے لوگوں کے ذمہ کیا ہے؟ چنانچہ امام ربیعؒ اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ ان کے ذمے کچھ بھی نہیں ہے۔ البتہ امام مالکؒ نے اتنا کہا ہے کہ اگر یہ لوگ روزانہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں تو میرے نزدیک پسندیدہ ہے۔ اور حضرت انسؓ۔ ابن عباسؓ۔ قیس بن السائب۔ اور ابو ہریرۃؓ نے فرمایا ہے کہ ان لوگوں کے ذمہ فدیہ ہے۔ امام شافعیؒ اور اصحاب الرائے (حنفیہ) امام احمدؒ اور امام اسحٰقؒ کا قول بھی یہی ہے۔ نیز ابن عباسؓ کی روایت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی ام ولد سے فرمایا جو حاملہ تھی یا بچے کو دودھ پلا رہی تھی کہ تو ان لوگوں میں سے ہے جو بڑی مشقت سے روزہ رکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا تیرے ذمہ فدیہ ہے قضا نہیں ہے۔

مفتی سید محمد عبدہٗ نے اس فہرست میں اور بھی اضافہ فرمایا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ

اَلَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ سے یہاں مراد بوڑھے، ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار کے دور ہو جانے کی امید نہیں ہوتی۔ ایسے ہی وہ لوگ بھی ان کے زمرے میں شمار ہوں گے جو مزدور پیشہ ہوں جن کی معاش خدا نے پر مشقت کاموں میں رکھ دی ہے۔ مثلاً کانوں سے کوئلہ نکالنے والے اور وہ مجرم جن سے قید خانوں میں مشقت کے کام لئے جاتے ہیں اور جن پر روزہ رکھنا گراں ہو۔۔۔۔۔۔ تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن پر کسی ایسی وجہ سے جن کے دور ہو جانے کی کوئی امید نہ ہو روزہ رکھنا گراں گزرتا ہو جیسے بڑھاپا۔ اور پیدائشی کمزوری۔ اور ہمیشہ محنت کے کاموں میں مشغولیت۔ اور پرانی بیماری جس کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو۔ ایسے ہی وہ شخص جس کی مشقت کا سبب ہوتا رہتا ہو جیسے حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت۔ ان سب لوگوں کے لئے جائز ہے کہ وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ اتنا کھانا جو ایک اوسط درجے کی خوراک کے آدمی کا پیٹ بھر سکے۔ (تفسیر المنار صفحہ ۱۵۵-۱۵۷ ج ۲)

ان تفاصیل سے حسب ذیل فہرست مرتب ہو جاتی ہے۔

۱۔ بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت

۲۔ حاملہ عورتیں

۳۔ دودھ پلانے والی عورتیں

۴۔ اپاہج اور معذور لوگ

۵۔ پرانی بیماریوں والے جن کے اچھا ہونے کی امید نہ ہے۔

۶۔ ایسے کمزور لوگ جو خلقی اور پیدائشی طور پر (CONSTITUTIONALLY) کمزور پیدا ہوئے ہوں۔

۷۔ وہ مزدوری پیشہ لوگ جن کی معاش ہمیشہ پُر مشقت کاموں میں ہوتی ہے۔ مثلاً کانوں میں کام کرنے والے۔ اور کارخانوں میں کام کرنے والے یا رکشہ چلانے والے۔

۸۔ وہ مجرم جن سے جیل میں مشقت کے کام لئے جاتے ہوں۔

یہ فہرست جامع اور مانع نہیں۔ بحالات موجودہ ملت اپنے حالات کے مطابق اس میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اصول یہی ہے کہ جو شخص بہ مشقت روزہ رکھ سکے وہ روزہ نہ رکھے۔

یہ ہیں روزوں کے متعلق مختصر الفاظ میں قرآن کے احکام۔ ان آیات کو آپ خود بھی قرآن کریم میں دیکھ لیں (یعنی سورۂ بقرہ۔ آیات ۱۸۳ تا ۱۸۸) ہم نے اس مقام پر صرف احکام کی وضاحت کی ہے روزوں کی حکمت سے بحث نہیں کی کیونکہ وہ الگ موضوع ہے۔

اشتہار اگر جنوری ۱۹۵۳ء کا طلوعِ اسلام کوئی صاحب فراہم کر سکیں تو مندرجہ ذیل پتہ پر خط و کتابت کریں۔

غلام محمود خاں۔ بان رسّی فروش۔ صدیق بازار۔ لاڑکانہ

شعلۂ مستور

محترم پرویز صاحب نے قرآن اور تاریخ کی روشنی میں جناب مسیحؑ کی زندگی کی حقیقی تصویر پیش کی ہے جس میں آپ کی پیدائش۔ ابتدائی زندگی۔ دعوت۔ آپ کے خلاف سازش۔ ہجرت وغیرہ کے واقعات کے علاوہ عیسائیت کے غلط عقائد۔ الوہیت۔ ابنیت۔ کفارہ وغیرہ پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔

ضخامت پونے تین سو صفحات۔ قیمت مجلد/ ۵/۸ روپے

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی۔ گلبرگ۔ لاہور

باب المراسلات

ایک مذہب گزیدہ کا خط

طلوعِ اسلام کی ڈاک میں قریب قریب ہر روز متعدد خطوط ایسے موصول ہوتے ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہوتا ہے کہ اس کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر نے کس طرح دین کا صحیح تصور اجاگر کر دیا۔ اور کس طرح قرآن کریم کا متعین فرمودہ سیدھا راستہ نگاہوں کے سامنے آگیا۔ ہم نے ان خطوط کی اشاعت کبھی ضروری نہیں سمجھی کیونکہ ان میں کچھ خودستائی کا شائبہ پایا جاتا ہے (یا کم از کم اس کا امکان محسوس ہوتا ہے) اور ہم اس سے اپنا دامن بچانا چاہتے ہیں لیکن ذیل کا خط ایسا ہے جسے ہم اپنی عام روش کے خلاف طلوعِ اسلام میں شائع کر رہے ہیں اسکی وجہ خط کا مضمون خود بتا دے گا۔ آپ سوچئے کہ اگر اس قسم کے غور و فکر کرنے والے حساس طبقے کے سامنے قرآن کا پیغام نہ آیا تو یہ انسانوں کے خود تراشیدہ مذہب کے ہاتھوں کہاں پہنچ جائے گا۔ یہ ہے وہ احساس جس نے ہم پر راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کر رکھا ہے۔

ضمناً اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ اگرچہ مکتوب نگار نے اپنے آپ کو "ایک سپاہی" لکھا ہے لیکن وہ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ ڈی ہیں۔

اب آپ ان کا خط ملاحظہ فرمائیے۔

محترمی و مکرمی جناب پرویز صاحب! السلام علیکم

میں نے آپ کے لکھے ہوئے ذیل کے پمفلٹس بڑی دلچسپی اور غور سے پڑھے ہیں۔

۱۔ علماء کون ہیں؟

۲۔ اردو زبان میں نماز

۳۔ اللہ کی لکڑی

۴۔ صلوات

۵. جشن نزول قرآن

۶. قوموں کے تمدن پر جذبات کا اثر

۷. مقامِ محمدیؐ

۸. بادۂ زندگی

پرویز صاحب! یقین جانیے آپ کے ان پمفلٹس کو پڑھ کر میرے دل کی دنیا ہی بدل گئی۔

میں تھیالوجی کا عالم نہیں ہوں۔ طالب علم ہوں۔ گذشتہ دس برس سے جب سے میں ...... سے لٹ لٹا کر اور سب چھوڑ کر پاکستان میں آیا ہوں۔ مذہب کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ کیونکہ پاکستان پہنچ کر میں نے مذہب کا اتنا غل و شور سنا کہ گھبرا گیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ مذہب اگر دنیا کے کسی حصہ میں رہ گیا ہے تو وہ پاکستان اور صرف پاکستان ہے۔ مگر جلدی ہی یہ حقیقت مجھ پر واضح ہو گئی کہ پاکستان کا مسلمان نہ صرف مذہبی طور پر بلکہ اخلاقی طور پر بالکل دیوالیہ ہو چکا ہے۔ اور قدرت کو منظور تھا کہ اسلام کا جنازہ پاکستان کے مسلمانوں کے کندھوں پر اٹھے۔ چنانچہ اٹھ چکا ہے۔

میں مذہب سے عموماً اور اسلام سے خصوصاً اتنا ہی دور تھا۔ جتنا مشرق سے مغرب۔ کیونکہ نہ مجھے گھر پر اور نہ اسکول میں اور نہ ہی کالج میں مذہب کے مطالعہ کا موقع ملا۔ پھر دوران قیام فرانس۔ انگلستان۔ اٹلی۔ یونان۔ ترکی۔ شام۔ فلسطین مصر، ایران اور عرب ایسی سوسائٹی نصیب ہوئی۔ جو لامذہبیت ہی کو مذہب سمجھتی تھی۔

اس لئے پاکستان پہنچ کر پیرانہ سالی کے باوجود میں نے اسلام کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اور جارج سیل۔ راڈول اور پامر کے تراجم قرآن خرید کر مطالعہ کئے۔ پھر بعض دوستوں کے مشورہ سے قرآن شریف کے اردو ترجمے بھی پڑھے۔ کچھ تفسیریں احادیث اور مذہبی کتابیں بھی پڑھیں۔

اور اس مختصر مذہبی مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ قرآن فہمی کا کوئی گُر مقصد جو مولوی صاحبان نہیں سمجھے تفسیروں کو پڑھ کر مبہوت رہ گیا۔ اعلیٰ رائے قائم کی کہ ان میں دنیا جہان کی باتیں ہیں بجز تفسیر کے۔ پھر جب حدیث کی طرف نگاہ کی تو اس کو ایک وسیع جنگل پایا۔ جو ہر طرف خس و خاشاک سے اٹا پڑا ہے جتنے منہ اتنی باتیں۔ نہ راوی کا ٹھکانہ، نہ روایت کا۔ ایک ہی فرقہ کی حدیثیں دوسرے فرقے سے مخالف۔ یہی نہیں۔ ایک ہی فرقہ کی حدیثیں اسی فرقہ کی اور حدیثوں کی تردید۔ آخر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ ایمانی امور میں احادیث سے بڑھ کر کوئی شے بے اعتبار نہیں۔ اور کہ اگر قرآن حدیث کی لاٹھی کا محتاج ہے تو یہ خدا کا کلام نہیں ہو سکتا۔ یعنی قرآن از قرآن بپرس و بس۔

مروجہ اسلام کو میں "ملاازم" سمجھا۔ اور اس "ملاازم" سے مجھے اتنی نفرت ہو گئی جتنی گناہ سے نفرت ہے۔ کیا "ملاازم" کو ہم یورپ اور امریکہ کے نافہموں کے سامنے پیش کر سکتے ہیں! دوران قیام انگلستان میں نے محسوس کیا کہ اس ملک میں مسلمان کہلانا ننگِ انسانیت ہے۔

میں نے مروجہ اسلام یعنی "ملاازم" کی بعض اشکال کو حل کرنے کے لیے چند چوٹی کے مولوی صاحبان سے ڈرتے ڈرتے خط وکتابت شروع کی۔ مگر انھوں نے مجھے "کافر" بنا دیا۔ اور عقلی باتوں کا جواب عقل سے نہیں لٹھ سے دیا۔

میری ہمت پست ہوگئی۔ دل برداشتہ ہوکر خاموش ہوگیا۔ اور مذہبی مطالعہ ہی بند کردیا۔ لیکن دل کی پریشانی اور دماغ کی بےچینی نے مجھے آرام کرنے نہ دیا۔ اور میں نے اپنے دماغ میں مذہب کا ایک نیا خاکہ تیار کیا۔ جس نے نقوش قائم کئے۔ جن کا ذکر میں نے صرف اپنے بعض بےتکلف دوستوں ہی سے کرنا مناسب سمجھا اور کسی سے نہیں۔

چونکہ میں اردو اخبارات اور رسائل نہیں پڑھتا اس لئے میں آپ کے اسم گرامی سے ناآشنا تھا۔ میں نے پہلی دفعہ آپ کا نام پاکستان ٹائمز میں پڑھا۔ اور سمجھا کہ پرویز صاحب بھی کوئی "ملاشاپ" کے فاضل ہوں گے۔ اور استنجے کے ڈھیلے کو مذہب سمجھتے ہوں گے۔ لیکن لاہور کے ایک دوست نے جو میری بیماری کی عیادت کو یہاں تشریف لائے۔ میری غلط فہمی کو دور کردیا۔ میرے یہ دوست نسبت روڈ پر آپ کے درس قرآن میں ایک دو دفعہ شمولیت حاصل کرکے استفادہ کرچکے ہیں۔

اس کے بعد میں نے آپ کے تصنیف کردہ پمفلٹس منگوائے جن کا ذکر خط کے شروع میں کرچکا ہوں۔ پڑھے۔ "ملاازم" کے ٹھیکیداروں کے رویے سے میرا یہ خیال ہوگیا تھا کہ مروجہ اسلام اور قرآن اس عہد ارتقا کا ساتھ نہیں دے سکتا اور انسانیت تمام مذاہب سے افضل ہے۔

پھر ۱۹۴۷ء کا خونی انقلاب سامنے آگیا کہ:

جو دھرم پہ بیتی دیکھ چکے جو مذہب پہ گزری دیکھ چکے
اس رام رحیم کی دنیا میں انسان کا جینا مشکل ہے

پرویز صاحب! دل کی انتہائی گہرائی اور صمیم قلب سے شکرگزار ہوں کہ آپ نے میری صحیح راہنمائی کی ہے۔ قرآن سے میں جس توقع کا خواہش مند تھا وہ مجھے آپ کے پمفلٹس میں نظر آگئی ہے۔

کہیں کہیں مجھے آپ سے اختلاف ضرور ہے۔ مگر وہ اصولی نہیں فروعی ہے۔ میں نے مذہب کا جو خاکہ اپنے دماغ میں وضع کیا تھا، وہ آپ کے پمفلٹس میں واضح اور درخشاں ہے۔

مولانا ڈپٹی نذیر احمد دہلوی نے اپنے قرآن کے حاشیہ پر ہم کو وارننگ دی ہے کہ قرآن کا "مضر خانہ" کاوش اور محققانہ نظر سے مطالعہ نہیں کرنا چاہیے کہ "ایمان متزلزل" ہو جائے گا۔ آپ نے یہ "خطرہ" رفع کردیا۔

آپ نے اپنے پمفلٹ "لمعات" میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ میں اس کی ضرورت ۱۹۴۸ء سے محسوس کر رہا ہوں۔ میں سپاہی آدمی ہوں۔ بڑے بڑے برٹش فیلڈ مارشلوں کے ساتھ کام کیا ہے۔ مارشل لا دیکھے ہیں۔ پاکستان کے مسلمان کی اصلاح اور سدھار کے لئے بے پناہ تشدد کی ضرورت ہے۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے۔ بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ مگر بوڑھا اور کمزور ہوں۔ ہاتھ میں سکت نہیں۔ زیادہ شوقِ ملاقات۔ تا زندہ ام بندہ ام۔

۲۔ تاریخ اور قرآن

لاہور سے ایک صاحب لکھتے ہیں۔

طلوع اسلام کی حالیٰ اشاعت میں آپ نے تاریخ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس نے بہت سے لوگوں کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ میں تو تاریخ کا طالب علم ہوں۔ میں جب اپنی تاریخ کے ان مقامات پر غور کرتا تھا تو ذہن میں اس قدر الجھنیں پیدا ہوتی تھیں کہ بیان سے باہر ہے۔ آپ نے صرف ایک واقعہ پر اکتفا کیا ہے۔ یعنی نبی اکرمؐ کی وفات کے بعد سب سے پہلے واقعہ پر لیکن جوں جوں ہم آگے بڑھتے ہیں، یہ الجھنیں زیادہ ہوتی جاتی ہیں۔ مثلاً میں تاریخ کی روشنی میں یزید کے واقعہ کو کبھی نہیں سمجھ سکا۔ صحیح بخاری میں ایک حدیث ہے کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ میری امت کا پہلا لشکر جو قسطنطنیہ پر حملہ کرے گا وہ بخشا ہوا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جس لشکر نے سب سے پہلے قسطنطنیہ پر حملہ کیا اس کا سپہ سالار یزید ابن معاویہ تھا اور اس میں حضرت عبداللہ بن عمر، عبداللہ ابن عباس، حضرت امام حسین رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر اصحاب بہ حیثیت سپاہی شریک تھے۔ خود صحیح بخاری کے شارح (القسطلانی نے لکھا ہے کہ یہ حدیث رسول کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے) امیر معاویہ اور یزید کی منقبت میں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر صحیح بخاری کی یہ حدیث صحیح ہے (اور جو حضرات علم حدیث میں سند مانے جاتے ہیں ان کا اصرار ہے کہ بخاری کی تمام حدیثیں صحیح ہیں) تو پھر جس شخص (یعنی یزید) کی بخشش کا یقین خود رسول اللہ دلائیں اس کے خلاف ہم لوگ (یعنی اہل سنت والجماعت) کس طرح لب کشائی کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں؟ یہ بات میرے دل میں مدت سے کھٹکتی چلی آ رہی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے یزید کی خلافت کے متعلق ایک طرف ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اس سے اسلام کی جڑ کٹ گئی۔ اور حضرت امام حسینؓ نے اس کے خلاف آواز بلند کر کے دین کی گرتی ہوئی عمارت کو سنبھال لیا۔ چنانچہ خواجہ معین الدین اجمیری علیہ الرحمۃ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ

حقا کہ بنائے لا الہ ہست حسینؓ

لیکن دوسری طرف ہمیں تاریخ بتاتی ہے کہ یزید کی بیعت میں کم از کم دو ہزار صحابہؓ شریک تھے اور باقی تابعین حضرات تھے۔ جن حضرات نے اس کی بیعت سے انکار کیا تھا ان کی تعداد شاید ان سے بھی کم ہو جنہوں نے (مثلاً) حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیعت میں شرکت نہیں کی تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر یزید کی خلافت سے اصولاً اسلام کی جڑ کٹتی تھی یا انفرادی طور پر وہ ایسا فاسق و فاجر تھا جیسا کہ بتایا جاتا ہے تو پھر اس قدر صحابہ اور تابعین حضرات رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اس کی بیعت کس طرح کر لی؟ اگر ہم یزید اور اس کی خلافت سے متعلق وہی عقیدہ رکھیں جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے تو پھر ان تمام صحابہؓ اور تابعینؒ حضرات کے متعلق کیا کہا جائے گا جنہوں نے اس کی بیعت کی تھی؟ اور اگر ان حضرات کے اس فیصلہ اور عمل کے متعلق سمجھا جائے کہ وہ حق کے مطابق تھا تو پھر ہم یزید کے خلاف کس طرح لب کشائی کر سکتے ہیں؟ اگر یہ کہا جائے کہ ان حضرات نے مجبوراً بیعت کی تھی۔ یعنی ان سے استبداداً بیعت لی گئی تھی۔ تو اس سے (معاف فرمائیے) ان حضرات (رضی اللہ عنہم) کی سیرت کے متعلق جو خیال پیدا ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اگر سوال کوئی فروعی سا ہوتا تب بھی شاید اس بات سے چشم پوشی

کرلی جاسکتی۔ لیکن یہ سوال ایسا اہم تھا جس پر خود اسلام کی عمارت کے قائم رہنے اور گر پڑنے کا دار و مدار تھا۔ ایسے اہم سوال کے متعلق یہ سمجھ لینا کہ ان تمام حضرات نے ڈر کے مارے بیعت کرلی اور جرأت ایمانی کا ثبوت صرف چند افراد (حضرت امام حسینؓ اور آپ کے ساتھیوں) نے دیا، صحابہ کبارؓ اور تابعینؒ کے متعلق جس قسم کا تصور پیدا کرتا ہے وہ ظاہر ہے۔ میرے دل میں ان تمام حضرات کی بڑی عظمت اور عقیدت ہے۔ اس لئے میں تو اس کا تصور تک بھی نہیں کرسکتا۔ لیکن دوسری طرف مشکل یہ آن پڑتی ہے کہ اگر ان حضرات کے اس عمل (یعنی یزید کی بیعت کرلینے) کو حق بجانب قرار دیا جائے تو پھر حضرت امام حسینؓ اور آپ کے ساتھیوں کے متعلق کیا کہا جائے گا۔ میرے دل میں ان کی بھی ویسی ہی عظمت اور عقیدت ہے۔

یہ ہیں وہ الجھنیں جن میں میں ایک مدت سے گرفتار ہوں اور جن کا کوئی حل میری سمجھ میں نہیں آتا۔ شیعہ حضرات نے اپنے لئے اس الجھن کا حل نکال لیا۔ یعنی انہوں نے یہ عقیدہ اختیار کرلیا کہ امام بھی رسول کی طرح خدا کی طرف سے مقرر کردہ ہوتا ہے اور یہ امامت حضرت علیؓ اور آپ کی اولاد میں رہنی تھی۔ جن لوگوں نے ان حضرات میں سے کسی کی بھی امامت کا انکار کیا، ان کا انکار ایسا ہی تھا جیسا نبوت کا انکار۔ لہٰذا ایسے لوگ حق پر ہو نہیں سکتے۔ اس میں نہ امت کے منتخب کردہ خلیفہ کا سوال ہے نہ باپ کے بعد وراثت میں خلافت پانے کا سوال۔ حتیٰ کہ اس میں نہ کسی خلیفہ کے فاسق و فاجر ہونے کا سوال ہے نہ صالح اور متقی ہونے کا سوال۔ شیعہ حضرات نے اپنے لئے یوں راستہ صاف کرلیا۔ لیکن ہم (سنی) جو اس عقیدہ کو صحیح نہیں سمجھتے، اس الجھن سے کس طرح نکلیں جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے؟ میں شکر گذار ہوں گا اگر آپ براہ کرم اس مشکل مسئلہ کے حل کی کوئی صورت بتا دیں گے۔

طلوع اسلام جب تک ہماری تاریخ وہی رہے گی جو اس وقت تک ہمارے ہاں چلی آرہی ہے اس الجھن (اور اس قسم کی سینکڑوں الجھنوں) کا کوئی حل پیش نہیں کیا جاسکتا۔ ان مشکلات کا علاج وہی ہے جسے ہم ایک مدت سے پیش کرتے چلے آرہے ہیں اور جسے ہم نے سابقہ اشاعت میں بھی دہرایا تھا۔ یعنی یہ کہ ہم اپنی تاریخ کو از سر نو مرتب کریں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو یقین مانئے ہم اپنی آنے والی (تعلیم یافتہ) نسلوں کو کبھی اسلام پر مطمئن نہیں کرسکیں گے۔ ہماری تاریخ اسی وقت تک ساتھ دے سکتی تھی جب تک ہم نے قوم کے لئے سوچنا حرام قرار دے رکھا تھا۔ ہماری نئی نسلوں نے سوچنا شروع کردیا ہے اور انہیں اس سے کوئی قوت باز نہیں رکھ سکتی۔ یہ خدا کے کائناتی قانون کا تقاضا ہے جسے کوئی روک نہیں سکتا۔ اگر ہم نے ان سوچنے والی نسلوں کو یہ بتایا (جیسا کہ ہم جہلا کو بتاتے چلے آرہے ہیں) کہ ہماری یہی تاریخ اسلام کی صحیح تعلیم کی مظہر ہے تو وہ اس قسم کے اسلام کو دل میں جگہ دینے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوں گے۔ ہمارے ارباب مذہب کو اس خطرہ کا کوئی احساس نہیں۔ وہ ان [illegible]ندہ ملحدین کا علاج گالیوں کے سوا کچھ اور جانتے ہی نہیں۔ نہ ہی وہ یہ چاہتے ہیں کہ قوم میں غور و فکر کی صلاحیت اور عادت پیدا ہو اس لئے کہ وہ کبھی اس پر آمادہ نہیں ہوسکتے کہ ہماری تاریخ کو کوئی ہاتھ تک بھی لگا سکے۔ یہ کام اسلامی حکومت کے کرنے کا ہے دیکھیں یہ سعادت کس کے حصے میں آتی ہے اور کب آتی ہے۔

آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے   مسکین و کم ماندہ دریں کشمکش اندر

نقد و نظر

۱۔ تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ

یعنی حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ کے انگریزی خطبات کا اردو ترجمہ، مع مقدمہ، حواشی، اور تصریحات۔ از سید نذیر نیازی صاحب

شائع کردہ۔ بزمِ اقبال، کلب روڈ۔ لاہور۔

علامہ اقبال کے لیکچروں کا مجموعہ ایک ہی کتاب ہے جس میں انھوں نے اپنے فلسفہ کو نثر میں بیان فرمایا ہے۔ یہ مجموعہ پہلی مرتبہ سنہ ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا اور جو لوگ انگریزی نہیں جانتے تھے انھیں اسی وقت سے اس کی آرزو اور شدید آرزو پیدا ہو گئی کہ ان لیکچروں کا اردو میں ترجمہ ہو جائے۔ کچھ عرصہ کے بعد سننے میں آیا کہ محترم سید نذیر نیازی صاحب نے ان لیکچروں کا ترجمہ کر لیا ہے۔ اور اسے حضرت علامہؒ کی تصویب بھی حاصل ہو گئی ہے۔ اس کے بعد اس ترجمہ کی اشاعت کے لئے لوگوں کو جس قدر شدید انتظار ہو سکتا تھا اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بالخصوص اس لئے کہ جاننے والا طبقہ جانتا تھا کہ ان لیکچروں کا ترجمہ کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہ تھی اور ایسے دشوار اور نازک کام کے لئے نیازی صاحب سے زیادہ موزوں شخصیت شاید ہی کوئی اور ہو سکتی تھی۔

لیکن اس انتظار کا عرصہ اس قدر طویل ہو گیا کہ منتظرین میں سے اکثر اس ترجمہ کی اشاعت کی طرف سے مایوس ہی ہو گئے۔ بارے قریب پچیس برس کے انتظار کے بعد اب یہ ترجمہ بزمِ اقبال (لاہور) کی طرف سے شائع ہو کر منتظرین کے ہاتھوں میں پہنچ گیا ہے۔ کتاب کے شروع میں قریب چالیس صفحات پر پھیلا ہوا مترجم کے قلم سے مقدمہ ہے جس میں ان خطبات کا ماحصل نہایت مختصر الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ پھر ۳۰۰ صفحات پر مشتمل حضرت علامہؒ کے ساتوں خطبات کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کے بعد خطبات کے مشکل مقامات کی مترجم کے قلم سے تصریحات ہیں۔ پھر مصطلحات۔ اشاریہ اور غلط نامہ۔ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے اور قیمت مجلد آٹھ روپے ہے۔

علامہ اقبال کے لیکچر ایک تو خالص فلسفیانہ زبان میں ہیں اور دوسرے انھوں نے الفاظ کے استعمال اور انتخاب میں اس قدر کفایت اور ارتکاز سے کام لیا ہے کہ بعض اوقات ایک ایک لفظ کی وضاحت کے لئے فقرے اور جملے نہیں بلکہ (PARAGRAPHS) لکھنے کی ضرورت لاحق ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی کتاب کا ترجمہ کرنا اور بالخصوص جبکہ مترجم نے

التزام یہ کیا ہو کہ ترجمہ "انگریزی متن کے عین مطابق ہو"؛ کس قدر مشکل کام ہوگا۔ نیازی صاحب مستحق مبارکباد ہیں کہ وہ اس قدر صبر طلب خارہ شگافی کے بعد جوئے شیر لانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ لیکن انھوں نے ترجمہ میں متن کی مطابقت کا جو التزام کیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جس طرح اصل لیکچرز سے صرف وہی لوگ مستفید ہو سکتے ہیں جو بلند فلسفیانہ مذاق (اور ذہن) رکھتے ہیں اسی طرح اس ترجمہ سے بھی وہی حضرات بات سمجھ سکیں گے جن کی ذہنی سطح ایسی ہی بلند ہوگی۔ (مثلاً ترجمہ کا ایک ٹکڑا دیکھئے لکھا ہے۔

> دلیل کونی کی رو سے کائنات ایک معلول متناہی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس کی کوئی علت بھی ہو لیکن پھر ہر علت کے لئے چونکہ ایک دوسری علت کا وجود مستلزم ہے اور ذہن انسانی کے لئے ممکن نہیں کہ ایک ابدی تسلسل کا تصور کرتا چلا جائے۔ اس نے ایک ایسی علت کا وجود تسلیم کرنا پڑا جو کسی دوسری علت کا معلول نہیں۔ یعنی علت اولیٰ یا علت العلل۔ لیکن اگر معلول متناہی ہے تو اس کی علت بھی متناہی ہوگی یا زیادہ سے زیادہ علل متناہیہ کا ایک لامتناہی سلسلہ۔

اس سے ہمارا مطلب یہ نہیں کہ ترجمہ کی زبان سلیس ہونی چاہئے تھی۔ ان خطبات کا "ترجمہ" سلیس زبان میں ہو نہیں سکتا۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ یا تو ان خطبات کے ترجمہ کے ساتھ ان کا مفہوم بھی مرتب کرنا چاہیئے تھا اور یا تصریحات اور حواشی اس قدر کثرت اور وضاحت کے ساتھ دیئے جانے چاہیئے تھے کہ بات صاف طور پر سمجھ میں آجاتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ نیازی صاحب نے تصریحات شذرات اور حواشی بڑی عجلت میں لکھے ہیں (یا پریشانی میں)۔ اگر انھیں وقت اور سکون میسر ہو جاتا تو یہ کتاب اس سے کہیں زیادہ مفید ہو سکتی تھی۔

چونکہ اس وقت ہمارے پیش نظر خطبات کا ترجمہ ہے اس لئے خود خطبات پر تبصرہ ہمارا مقصود نہیں لیکن ایک نکتہ ایسا ہے جس کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

قرآن کریم نے سمع و بصر و فؤاد (یا قلب) کو علم کا ذریعہ بتایا ہے (۱۷/۳۶)۔ سمع و بصر سے مراد ہے انسانی حواس (SENSE PERCEPTION) اور فؤاد یا قلب کے متعلق اس نے خود کہہ دیا کہ اس سے انسان سمجھنے سوچنے کا کام لیتا ہے (۲۲/۴۶، ۷/۱۷۹)۔ گویا فؤاد یا قلب انسان کی عقلی اور فکری صلاحیت (INTELLECTUAL FACULTY) کا نام ہے۔ لہٰذا قرآن کی رو سے حصول علم کا طریق یہ ہے کہ انسان کے حواس اطلاعات بہم پہنچائیں اور قلب (MIND) ان سے نتائج مستنبط کرے۔

نزول قرآن سے پہلے یہ عقیدہ عام طور پر پایا جاتا تھا کہ ادراک بالحواس کے علاوہ حصول علم کا ذریعہ ایک اور بھی ہے اور اسے باطنی واردات (INNER EXPERIENCE) کہا جاتا ہے۔ اس سے انسان پر براہ راست انکشاف حقیقت ہوتا ہے۔ ادراک بالحواس کا طریق ظنی اور غیر یقینی ہے جس پر غلطی کا ہر وقت احتمال ہے۔ لیکن جو علم باطنی واردات سے حاصل ہوتا ہے وہ حتمی اور

یقینی ہوتا ہے اور اس پر بالکلیہ اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

قرآن نے آکر کہا کہ ادراک بالحواس کے علاوہ علم کا سرچشمہ وحی ہے لیکن وہ صرف حضرات انبیائے کرام کے لئے مخصوص ہے۔ غیر از نبی اس میں شریک نہیں ہو سکتا۔ یہ وحی آخری مرتبہ نبی اکرمؐ کو ملی اور قرآن کے اندر محفوظ کر دی گئی۔ اس کے بعد باب نبوت بند ہو گیا۔ لہٰذا ختم نبوت کے بعد علم کا ذریعہ ایک ہی رہ گیا۔ یعنی عقلی اور فکری ذریعہ۔ حتیٰ کہ خود قرآن کریم کے سمجھنے کے لئے بھی تدبر و تفکر کا حکم دیا گیا ہے۔ اس طرح قرآن نے واردات باطنی کے اس قدیم (اور باطل) عقیدہ کو ختم کر دیا جس نے انسانی قوائے عقلیہ کو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ اب نوع انسانی کے پاس علم کی روشنی کے دو ہی ذرائع رہ گئے۔ خدا کی کتاب اور فکر انسانی۔

لیکن جب کچھ عرصہ کے بعد غیر قرآنی تصورات دین کا لقاب اوڑھ کر مسلمانوں کی زندگی کے ہر گوشے پر چھا گئے تو باطنی واردات بھی ذریعۂ علم قرار پا گیا اور جس طرح سابقہ قوموں نے اسے مذہب کی اصل و بنیاد سمجھ لیا تھا ان کے ہاں بھی یہ (تصوف) "مغز دین" سمجھا جانے لگا۔ امت کی تباہی کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ عقیدہ بھی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے تصوف کے متعلق بالکل درست کہا تھا کہ یہ

اسلام کی سرزمین میں ایک اجنبی پودا ہے

اور تصوف کے روح رواں شیخ محی الدین ابن عربی کی کتاب فصوص الحکم کے متعلق بالکل بجا فرمایا تھا کہ

اس میں الحاد اور زندقہ کے سوا کچھ نہیں

حقیقت یہ ہے کہ "باطنی واردات کے ذریعہ علم حاصل ہونے کا عقیدہ قرآن کی تعلیم کا نقیض اور مہر نبوت کو توڑ دینے کے لئے سب سے بڑا حربہ ہے۔ اس کے بعد نہ قرآن علم خداوندی کا واحد اور آخری ضابطہ رہتا ہے اور نہ ہی نبی اکرمؐ وحی کے آخری مہبط۔ اس لئے کہ وحی کا نام الہام یا کشف رکھ دینے سے حقیقت نہیں بدل جاتی۔"

تصوف کی بنیاد باطنی واردات کا عقیدہ ہی ہے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وہی حضرت علامہؒ جو تصوف کو اسلام کی سرزمین میں ایک اجنبی پودا قرار دیتے ہیں، اپنے لیکچرز میں واردات باطنی کو بڑا اہم ذریعہ علم ٹھہراتے ہیں اور حیرت ہے کہ اس کی دلیل یہ لاتے ہیں کہ قرآن نے سمع و بصر کے ساتھ فؤاد یا قلب کو بھی ذریعہ علم قرار دیا ہے۔ اور اس کے معنی باطنی واردات کے ہیں۔ مثلاً آپ فرماتے ہیں۔

> یہی وجہ ہے کہ حقیقت مطلقہ کے تمام و کمال انکشاف کی خاطر ادراک بالحواس کے ساتھ ساتھ اس چیز کے مدرکات کا اضافہ بھی ضروری ہے جسے قرآن نے فؤاد یا قلب سے تعبیر کیا ہے (۳۲:۹) قلب گویا ایک طرح کا وجدان یا اندرونی بصیرت ہے جس کی پرورش مولانا رومؒ کے دلکش الفاظ میں نور آفتاب سے ہوتی ہے اور جس کی بدولت ہم حقیقت مطلقہ کے ان پہلوؤں سے اتصال پیدا کر لیتے ہیں جو

ادراک یا حواس سے ماوراء ہیں۔ قرآن مجید کے نزدیک قلب کو قوتِ دید حاصل ہے اور اس کی اطلاعات بشرطیکہ ان کی تعبیر صحت کے ساتھ کی جائے کبھی غلط نہیں ہوتیں۔ (ص ۲۳)

حضرت علامہؒ نے قلب کو وجدان یا اندرونی بصیرت قرار دیا ہے اور اسی سے وہ باطنی واردات کے حق میں قرآن سے تائید لاتے ہیں۔ حالانکہ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) قرآن کریم نے قلب کے متعلق کہا ہے لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا (۷/۱۷۹) "ان کے پاس قلوب ہیں لیکن وہ ان سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔" دوسری جگہ ہے فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَّعْقِلُونَ بِهَا (۲۲/۴۶) "ان کے قلوب ہوتے جن سے یہ سمجھنے کا کام لیتے۔" لہٰذا قرآن کی رو سے قلب عقل و فکر کا ذریعہ ہے نہ کہ وجدان یا اندرونی بصیرت "جس کی پرورش [illegible] سے ہوتی ہے۔ حضرت علامہؒ نے ایک صوفی کے احوال اور نبی کے مشاہدات کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے تو یہاں تک بھی مترشح ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک دونوں کے علم کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ البتہ ان کے عملی نتائج میں فرق ہوتا ہے۔ وہ اس باب میں فرماتے ہیں۔

> پھر جب صوفی کسی ذاتِ مرموز سے اتحاد و اتصال کی بدولت یہ محسوس کرتا ہے کہ زمانِ متسلسل کی کوئی حقیقت نہیں تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ زمانِ متسلسل سے اس کا تعلق سچ مچ منقطع ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اپنی یکتائی کے باوجود صوفیانہ مشاہدات اور ہمارے روزمرہ کے محسوسات و مدرکات میں کوئی نہ کوئی رشتہ ضرور کام کر رہا ہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ صوفیانہ احوال تادیر قائم نہیں رہتے۔ وہ صاحبِ حال پر وثوق و اعتماد کا نہایت گہرا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ بہرحال صوفیاء ہوں یا انبیاء دونوں عام واردات کی دنیا میں واپس آجاتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم آگے چل کر عرض کریں گے فرق ہے تو یہ کہ نبی کی بازگشت سے نوعِ انسانی کے لئے بڑے بڑے دوررس نتائج مترتب ہوتے ہیں۔
>
> (ص ۲۳)

اس سے ظاہر ہے کہ علامہؒ اقبال کے نزدیک نبی اور صوفی کے علم میں کیفیت اور ماہیت کے اعتبار سے (یعنی QUALITATIVE) فرق نہیں ہوتا۔ فرق ہوتا ہے تو کمیت کا (یعنی QUANTITATIVE)۔ یا اس اعتبار سے کہ نبی کی قوتِ عمل صوفی کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے نبی کا پیغام زیادہ دوررس نتائج مرتب کر دیتا ہے۔

بہرحال جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے واردات باطنی کو ذریعہ علم تسلیم کر لینے سے تصوف کا وہ پودا جسے حضرت علامہ اسلام کی سرزمین میں اجنبی قرار دیتے ہیں ایک تناور درخت کی طرح جڑ پکڑ لیتا ہے اور پھر اس کے اکھڑنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ یہ تھا وہ اہم نکتہ جسے ہم اس مقام پر سامنے لانا ضروری سمجھتے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ محترم نیازی صاحب کو اس ضمن میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھنا چاہیئے تھا۔ یہ موضوع تفصیلی بحث کا متقاضی ہے اور اگر محترم موصوف اس باب میں کچھ لکھنا چاہیں تو اس کے لئے طلوعِ اسلام کے صفحات ہر وقت کھلے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ ہم سے متفق ہوں گے کہ اگر اس مسئلہ کو اسی طرح غیر واضح

مٹنے دیا گیا تو اس سے بڑے مفر نتائج پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ ایسے ہی غیر واضح مقالات کا نتیجہ ہے کہ لوگوں نے ابھی سے نہ معلوم علامہ اقبالؒ کو کیا کچھ بنانا شروع کر دیا ہے، اور اس طرح ان کی وہ تمام کوشش جو انھوں نے امت کو قرآن کی طرف لانے میں صرف کی تھی بے نتیجہ بنائی جا رہی ہے۔ نہ صرف بے نتیجہ بنائی جا رہی ہے۔ بلکہ بعض اوقات اسے اسی قسم کے "الحاد اور زندقہ" کی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے جسے انھوں نے "فصوص الحکم" کی تعلیم کا ماحصل قرار دیا تھا۔

۲۔ CAPTIVE KASHMIR (انگریزی)

وہ کونسا پاکستانی ہے جس کے دل میں کشمیر کے خیال سے ہوک سی نہیں اٹھتی۔ لیکن کتنے ہیں جنھیں معلوم ہے کہ کشمیر کا مسئلہ کیا ہے۔ بات کیا تھی اور کیا ہو گئی ہے۔ ہم کیا چاہتے ہیں اور اہلِ کشمیر کیا چاہتے ہیں۔ بھارت کیا کچھ کر رہا ہے۔ مجلس اقوامِ متحدہ میں اس سوال کے متعلق کیا ہوتا رہا ہے اور کیا ہو رہا ہے۔ کشمیری مسلمانوں پر کیا کچھ بیت رہی ہے۔ اور ان کے مصائب کا حل کیا ہے ——— یہ ہیں وہ سوالات جن کا جواب مسٹر عزیز بیگ (ایڈیٹر اسٹار) نے اپنی زیرِ تبصرہ کتاب میں بڑی حسن و خوبی سے دیا ہے۔ معلومات مستند ہیں اور اسلوبِ بیان بتاتا ہے کہ لکھنے والے کے دل میں بے پناہ جذبات کا تلاطم برپا ہے۔ ایک ضمیمہ میں اس مسئلہ کے متعلق مختلف ممالک کے اخبارات کے افکار و آراء کو سامنے لا کر پنڈت نہرو کو بتایا گیا ہے کہ ——— ہمتِ بے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا؟ ——— کتاب کا پہلا ایڈیشن ستمبر ۱۹۵۵ء شائع ہوا۔ دوسرا نومبر ۱۹۵۷ء میں۔ تیسرا جون ۱۹۵۸ء میں۔ اور معلوم ہوا ہے کہ چوتھا ایڈیشن اب زیرِ طباعت ہے۔ اس سے کتاب کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ضخامت قریب اڑھائی سو صفحات۔ قیمت آٹھ روپے۔ ناشرین۔ الائیڈ بزنس کارپوریشن۔ دی مال۔ لاہور

ضرورتِ رشتہ

طلوعِ اسلام کے ہم فکر حضرات میں سے ایک باعزت، شریف گاؤں کے رہنے والے رفیق کو اپنی نا کتخدا صاحبزادی کے لئے رشتہ کی تلاش ہے۔ لڑکی خوش شکل۔ خوش سیرت۔ خوش سلیقہ۔ خوش اطوار ہے۔ زندگی دیہاتی۔ معمولی تعلیم خط و کتابت کا پتہ۔

ع۔م۔ معرفت طلوعِ اسلام ۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور